فہرست

لمعات

ہمارا پاکستان قرآن کی روشنی میں	مرتبہ محمد سلیم اختر (لاہور)	3
عید مبارک	ادارہ	5
ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	مرتبہ بزم طلوع اسلام لندن	6
اصل حکمران۔۔بیوروکریسی	غلام احمد پرویزؒ	11
قرآن اور سائنس	سید امتیاز احمد (لاہور)	15
وجود باری تعالیٰ کے دلائل	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی (کراچی)	17
تزکیہ	غلام باری، (مانچسٹر)	22
اندھیری وادیوں کے مسافر	ڈاکٹر شگفتہ طاہر، (کراچی)	26
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	34

ENGLISH SECTION

SOCIAL VALUE SYSTEM
By Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq 1

احادیث نبوی ﷺ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ ہی کے ہیں۔ اسی لئے زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہئے۔ (کتاب الاموال)

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینہ میں ان کے بال بچوں پر فاقہ کی نوبت آ جاتی تو یہ سب لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں''۔ (بخاری، مسلم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

ہمارا پاکستان: قرآن کی روشنی میں

کوئی قوم خدا کے عذاب میں اس وقت مبتلا ہوتی ہے، جب وہ قوم اقدارِ الٰہی (قانونِ خداوندی) کو دانستہ یا نادانستہ چھوڑ کر ان کے خلاف نظام قائم کر لیتی ہے۔ عذاب کی اولیں شکل یہ ہوتی ہے کہ: یَلْبِسَکُمْ شِیَعاً وَیُذِیْقَ بَعْضَکُم بَأْسَ بَعْضٍ (6/65) اللہ (کا قانون یہ ہے کہ تمہارے اعمال کی سزا کے طور پر وہ تمہیں) مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کر دے جس سے تم آپس میں سر پھٹول شروع کر دو۔ پاکستان کے سرحدی اضلاع اور شمالی علاقہ جات میں فرقہ وارانہ قتل و غارت گری اس کی موجود و مشہود مثال ہے۔ جہاں آئے دن شیعہ سنی کو مارتا ہے سنی شیعہ کو مارتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں میں بھی بم پھٹتے ہیں اور فائرنگ کی جاتی ہے۔

دوسری قسم کا عذاب اس قسم کا ہوتا ہے کہ نافرمان قوموں کی بستیاں کچھ اس طرح سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں گویا وہ کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے انگارے ہیں (قبائلی علاقہ جات کا منظر نامہ) (21/15)۔ ان کی آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے فلک بوس محلات پیوندِ زمین ہو جاتے ہیں اور ان کے کنویں (چاہے پانی کے ہوں یا تیل کے) بیکار ہو جاتے ہیں (جس طرح عراق اور ایران کے تیل کے بھرپور چشمے) (22/45) اور تاریخ کے صفحات پر فقط ان کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں (23/44)۔

تیسری قسم کے عذاب کی یہ شکل ہوتی ہے کہ وہ قوم کسی دوسری قوم کی محکوم و غلام ہو جاتی ہے (جسے استبدالِ اقوام کہا جاتا ہے 47/28) یہ عذاب پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مہیب اور رُسوا کن ہوتا ہے۔ اس سے قومیں اپنا تشخص کھو بیٹھتی ہیں۔ یہ کچھ یونہی فوری طور پر نہیں ہو جاتا۔ بلکہ قانونِ الٰہی کی نافرمانی کے اثرات آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے Slow Poisoning۔ یہ مضمر اثرات مکمل ہو کر عذاب کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی رو سے اگر کسی قوم پر کتاب اللہ کے سوا کسی اور قانون کی حکمرانی ہو تو وہ قوم محکوم ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ خود ہی حکمران کیوں نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر غیرت و حمیت کا دیوالیہ پن کیا ہو سکتا ہے؟ اس اعتبار سے مسلمانوں کی تمام آزاد مملکتیں سینکڑوں سالوں سے مسلسل محکوم چلی آ رہی ہیں کیونکہ آزادی صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت کا نام ہے۔

قوموں سے آگے بڑھیں تو پوری انسانیت سامنے آ جاتی ہے۔ اگر انسان قانونِ الٰہی سے منہ پھیر لے تو پھر خدا بھی اس کی حفاظت اور نشوونما سے دستکش ہو جاتا ہے۔ جس سے اس کا ارتقاء اور نشوونما رک جاتی ہے۔ اسے فسق کہا جاتا ہے۔ اس طرح بالآخران میں زندہ رہنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے حرکت میں میں آ جانے کا امکان ہے جس سے وہ ایسی مخلوق کو معدوم کر دے اور اس کی جگہ ایک نئی باصلاحیت مخلوق کو لے آئے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍo وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍo (14/19-20)-

جس چیز میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی، وہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایسی چیز لے لیتی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے اعمال تعمیری نتائج پیدا نہیں کریں گے۔ تو تم کائناتی نقشہ میں فٹ نہیں بیٹھ سکو گے اور خدا کا کائناتی قانون تمہیں نکال باہر پھینکے گا اور تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے گا اور ایسا کرنا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں!

اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے لئے یہ بھی مشکل نہیں کہ اگر ساری کی ساری نوعِ انسانی (غلط راہوں پر چل نکلے تو ان) کی جگہ ایک ''نئی مخلوق'' لے آئے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا۔

إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ وَكَانَ اللّهُ عَلَى ذَلِكَ قَدِيراًo (4/133)-

ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں کہ ہم موجودہ نوعِ انسان کو ختم کر دیں اور اسکی جگہ ایسی نوع کو لے آئیں جو باصلاحیت ہوگی۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ ''مسلمان'' محرومی اور زبوں حالی کے جس مرض میں مبتلا ہیں، یہ وہی ہے جو آدم کو لاحق ہوا تھا۔ یعنی قانونِ الٰہی سے انحراف اور علاج بھی اس کا وہی ہے (اقبال کی زبان میں ''آبِ نشاط انگیز'' یعنی قرآنِ کریم) جو آدم کو تجویز کیا گیا تھا کہ فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (2/38) یہ ہدایت آج بھی اپنی مکمل اور مُنَزَّہ صُورت میں ہمارے پاس موجود ہے، اس لئے ہم پستی سے ابھر کر پھر اسی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ہم گرے تھے۔ آدم کی لغزش ابلیس کی لغزش نہیں جس میں گر کر پھر ابھرنا نہیں، ٹوٹ کر پھر بننا نہیں۔

آخر گناہ گار ہیں کافر نہیں ہیں ہم!

جب ابدی مایوسی نہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے کھوئے ہوئے مقام کی بازیابی کی کیا صورت ہے؟ جواب بالکل سہل اور سادہ ہے۔ ہماری نشاۃِ ثانیہ کے دو اجزاء لاینفک ہیں۔ ایک **تمسک بالقرآن** اور دوسرے اجتماعی زندگی کے تخیل کا احیاء۔ کیونکہ **لا اسلام الا بالجماعۃ**۔ قرآن تو ہمارے پاس موجود ہے۔ جہاں تک تشکیلِ جماعت کا تعلق ہے یہ اس وقت ممکن ہے جب دنیا کے مسلمان مسلکی، گروہی اور علاقائی عصبیتوں کے بت توڑ کر جسدِ واحد کی طرح بصورتِ ملت اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (3/103) کے مصداق ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں کہ قومیں اوطان سے نہیں، تصورِ حیات سے بنتی ہیں۔ لہٰذا مختلف علاقوں اور خطوں میں رہتے ہوئے بھی مسلمانانِ عالم ایک قوم کے افراد ہیں۔ إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً اس لئے کہ ان سب کا خدا ایک ہے۔ وَأَنَا رَبُّكُمْ.....o (21/93)۔

اگر آج بھی مسلمان اپنے معاملات قرآنِ حکیم کے تابع کر لیں اور ایک قوم بن کر منظرِ عام پر آئیں تو دنیا دیکھے گی کہ ایک ارب سے بھی زیادہ مسلمانوں کا سیلاب بے پناہ کس طرح باطل قوتوں کو راہِ راست (صراطِ مستقیم) پر لے آتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرتبہ بزم لندن

ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

عیدالفطر

دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے۔ ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تیوہار مناتے ہیں لیکن اس عید کا تہوار وہ ہے جسے بطور جشن مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے اس تیوہار کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سورہ یونس میں ہے:

''اے نوع انسان تمہارے رب کی جانب سے ایک ضابطہ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں سامان پرورش اور منزل انسانیت تک پہنچنے کی راہنمائی ہے۔'' (10/57)-

اس کے بعد فرمایا:

''اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا بے مثال ضابطہ زندگی مل گیا ہے تم کیا اگر ساری دنیا کے انسان بھی مل کر کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا' لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسی قیمتی چیز کے اس طرح مفت مل جانے پر جشن مسرت مناؤ۔ وہ دولت کہ انسان جو کچھ بھی جمع کرے یہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔'' (10/58)-

یہ ہے وہ تقریب جسے بطور جشن منانے کی تاکید خدا نے کی ہے یعنی جشن نزول قرآن اور نزول قرآن کی ابتداء چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی (2/185) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کے لئے تھا اور عیدالفطر اس جشن کی تکمیل کا دن۔ پورے تیس دن کے روزے تیاری میں۔ یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر ہمیں دیا کیا ہے جس کے لئے ہم سے جشن مسرت منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سوال کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کہا ہے کہ۔۔۔ اے رسول! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس شمع نورانی کے ذریعے نوع انسان کو تاریکیوں سے

نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (10/57-58)۔ ذرا سوچئے کہ تاریکی میں کیا ہوتا ہے اور روشنی اس کی جگہ کیا کرتی ہے؟ تاریکی میں کسی شے کا مقام متعین نہیں ہوتا۔ روشنی میں ہر شے اپنی صحیح حقیقت کے ساتھ اپنے مقام پر نظر آ جاتی ہے۔ یہ تاریکی ہی ہے جس میں ہم رسی کو سانپ اور سانپ۔ کو بعض اوقات رسی سمجھ لیتے ہیں۔ روشنی آ جانے سے رسی رسی اور سانپ سانپ کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔

نزول قرآن سے قبل تاریکیاں

نزول قرآن سے پہلے انسان پر اس قدر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں کہ نہ وہ خارجی کائنات کی کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا نہ وہ اپنے مقام سے آگاہ تھا۔

یہ تاریکیاں کیا تھیں؟ دل و دماغ کی تاریکیاں' فکر و نظر کی تاریکیاں یعنی جہالت اور توہم پرستی کی تاریکیاں۔ مختصراً یہ کہ اپنے مقام سے بیگانگی کی تاریکیاں اور حقیقت یہ ہے کہ تمام تاریکیوں کا منبع یہی تاریکی تھی باقی سب تاریکیاں اس کی پیداوار تھیں۔ اگر انسان پر اس کا صحیح مقام روشن ہو جائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کا صحیح مقام کیا بتایا ہے؟ اس سوال کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کے لئے سارے کا سارا قرآن سامنے لانا پڑے گا جس کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں' لہٰذا اس کے صرف چند ایک گوشے ہی سامنے لائے جا سکتے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نزول قرآن سے پہلے انسان کن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اور کن پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ نزول قرآن کے وقت انسان کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔۔ انسان' انسان کی پرستش کرتا تھا۔ غلامی کا جواء اس کی گردن میں پڑا ہوا تھا۔ کہیں ملوکیت کا فولادی پنجہ اس کی رگ جان کو دبائے ہوئے تھا۔ کہیں رہبانیت کی غیر فطری زندگی اس کے دل و دماغ کو بری طرح ناکارہ بنائے ہوئے تھی۔ کہیں سرمایہ دار کی ہوس اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی تھی۔ یہ تھی انسان کی کیفیت۔

توہم پرستی

جب قرآن آیا اور اس نے اعلان کیا کہ خدا کے اس رسول ﷺ کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ یہ ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسان جکڑا چلا آ رہا ہے۔ یہ اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ سے یہ کچلا جا رہا ہے (7/157)۔ ان زنجیروں میں سب سے پہلی زنجیر اس کی توہم پرستی کی تھی جس کی رو سے یہ خارجی کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا۔ بادل گرجا اور یہ سہم گیا۔ بجلی کڑکی اور یہ دبک کر بیٹھ گیا۔ پہاڑ سامنے آیا تو اس کی ہیبت سے لرز اٹھا۔ ان قوتوں کے خطرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی طریق آ سکتا تھا اور وہ یہ کہ

ان قوتوں کو خدا تسلیم کر لیا جائے' ان کے سامنے جھکا جائے' ان کی پرستش کی جائے' ان کے حضور قربانیاں دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔

مقام آدمیت

خارجی قوتوں کے مقابلہ میں یہ تھا وہ مقام جو انسان نے اپنے لئے تجویز کر رکھا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے کہا کہ تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ۔۔۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ (45/12-13, 31/20) اگر تم ذرا غور و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کا مقام کیا ہے اور تمہارا مقام کیا۔ یہ سب خادم ہیں اور انسان ان کا مخدوم۔ یہ سب قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ جوں جوں تم ان قوانین کا علم حاصل کرتے جاؤ گے یہ قوتیں تمہارے سامنے جھکتی جائیں گی۔

سنت اللہ

یہ قوانین جن کے مطابق یہ بڑی بڑی قوتیں مصروف عمل ہیں' اٹل ہیں' نہ بدلنے والے قوانین ہیں۔ اس لئے تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہونا چاہئے کہ نہ معلوم کس وقت یہ قانون بدل جائے اور یہ قوتیں میرے قابو سے نکل جائیں۔ یہاں پر ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے' قانون کے مطابق ہوتی رہے گی اور ان قوانین میں کبھی بھی تبدیلی نہیں آئے گی (33/62)- یہ تھا وہ آئینہ جس میں قرآن نے انسان کو اس کی حقیقی شکل دکھائی تو وہ ایک ہی جست میں مسجود ملائک اور مخدوم کائنات بن گیا۔ انسان کے لئے مجبور محض اشیائے کائنات کو مسخر کر لینا پھر بھی آسان تھا' مشکل مرحلہ وہ تھا جہاں انسان دوسرے انسان کے ظلم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیر انسانی حکمرانی کی تھی اور اس خوئے غلامی میں اسے اس قدر پختہ کر دیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی محکومیت کو اپنی فطرت کا تقاضہ اور ان کا پیدائشی حق سمجھنے لگ گیا تھا۔

حق حکومت

قرآن کریم آیا اور اس نے اعلان کیا کہ۔۔۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ خدا نے اسے کتاب' حکومت حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ دی ہو' کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میری محکومی اختیار کرو۔ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کتاب خداوندی کی اطاعت کرو جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو (3/78-79)- آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے اس اعلان نے انسان کو کس طرح ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کی محکومیت کی دعوت دی۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم اسی بنیادی نقطہ کی

شرح ہے کہ۔۔۔ اطاعت صرف قوانین خداوندی کی کرو' ان کے علاوہ کسی انسان کی اطاعت مت کرو (12/40)- انسان کا تخلیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی محکومیت کرے اگر اس نے اس کے علاوہ کسی اور کی محکومی اختیار کی تو یہ اس کی تخلیق کے مقصد کے خلاف ہوگا۔ یہ تو تھا ملوکیت کا ظلم جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا وہ چاہتا تو اپنے دل و دماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا لیکن اس سے آگے انسان کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کے دل و دماغ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

مذہبی پیشوائیت

یہ غلامی تھی مذہبی پیشوائیت کی جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی۔ قرآن کریم نے انسان کو آواز دی اور اس سے کہا کہ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ پیران طریقت ہوں یا علمائے شریعت ان کا سارا مسئلہ معاشی ہے لیکن یہ اسے مذہب کے پردے میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں (9/34)- دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔ یہ خدا سے ورے خود خدا بن بیٹھے ہیں۔ اس لئے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے' راستے میں ہی روک لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر لوگ خدا تک پہنچ جائیں یعنی اس کی اس کتاب کو اپنا راہنما بنا لیں تو ان خدا کے نمائندوں کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرہیں اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔ زندہ انسان ان مردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے' ان کے حضور منتیں مانتا اور نذانے گزارتا ہے۔ جہاں تک مُردوں کی غلامی کا تعلق تھا قرآن نے زندہ انسانوں سے کہا کہ ذرا سوچو کہ جن ہستیوں کو تم اپنا ''خدا'' سمجھ رہے ہو ان کی حالت یہ ہے کہ۔۔۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے اور اگر وہ بفرض محال تمہاری پکار سن بھی لیں تو اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی بے خبری کی یہ حالت ہے کہ ان مردوں کو خود اپنے متعلق بھی علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے (46/4-5, 27/65, 25/3)- لہٰذا ان سے ڈرنا کیوں اور ان سے مرادیں کیوں وابستہ کرنا۔ یہ انسان کی انتہائی پستی ہے کہ وہ مُردوں سے ڈرتا رہے اور انہیں اپنا حاجت روا تسلیم کرے۔

منشورِ آزادی

انسان کو انسان کے آگے جھکانے کی ایک موثر

تدبیر یہ تھی کہ اسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اسے بھوکا رکھ کر اس سے اپنا حکم منوا لیا جائے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملے میں کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہے۔ ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں' ان کے بھی اور ان کی اولاد کے بھی۔ ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کے بجائے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو (17/31, 11/6, 6/152)- یہ تھے وہ تصورات جو قرآن نے دیئے اور اس طرح انسانوں کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کیا (17/70) اور ان سے کہہ دیا کہ اگر تم قرآنی قوانین پر کاربند ہو گے تو تمہیں ایک ایسا معاشرہ میسر آ جائے گا جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ ہوگا نہ خوف وحزن (10/62-64, 7/35, 2/37-38)- بلکہ ہر طرح کا اطمینان اور ہر طرح کی سلامتی میسر ہوگی۔

مساوات انسانی

اس میں ہر انسانی بچے کو زندگی کی دوڑ میں مقابلے کے لئے ایک جیسا میدان ملے گا۔ نہ کسی سے بے جا رعایت ہوگی نہ کسی کے راستے میں رکاوٹ آئے گی۔ جس کا جی چاہے اپنی محنت سے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے اپنی بے عملی سے پیچھے رہ جائے۔ یہاں ہر فیصلہ انسان کے جوہر ذاتی اور عمل مسلسل کے مطابق ہوگا (99/7-8, 46/19)- یہ نہ ہوگا کہ بڑے باپ کا بیٹا سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہو اور غریب کا بیٹا ابتدائی تعلیم تک بھی نہ حاصل کر سکے کیونکہ اس کے باپ کے پاس اسے سکول میں داخل کروانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ پیدائشی تفریق برہمن کی خود ساختہ زنجیریں تھیں جن میں وہ شودر کو جکڑے رکھتا تھا۔ قرآن کریم نے انسان کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے نوع انسان کو قرآن دیا گیا اور اسے کہا گیا تھا کہ ایسے منشور حریت و آزادی کے عطا ہونے پر جشن مناؤ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

اصل حکمران۔۔ بیوروکریسی

یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) ''نوکر شاہی'' آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلوب پر کم غور کیا ہوگا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ اس مشین کا آپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلقہ ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے۔ اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسانوں سے ہوتا ہے' مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (Materialism) سے جب تصورِ حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کر لیا گیا۔ اسے کہتے ہی (Mechanical Concept of Life) ہیں۔ اس سے انسانوں کے (Human Beings) ہونے کا تصور ختم ہو گیا اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم ونسق کے لئے بھی کچھ قواعد وضوابط منضبط کئے اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد وضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (Case) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ' اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کر دیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظام حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس

نظام حکومت میں سب سے زیادہ قابل۔ دیانت دار۔ ذمہ دار۔ معتمد علیہ افسر' اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر' انکے معاملات کا متعلقہ قواعد وضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بھی اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر دیا' اور افسران بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی ہے' نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد وضوابط کی رو سے (میکانکی طور پر) کر دیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے ''انسانیت'' پر کیا گذری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار لگے' درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطراب پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد و ضوابط کے مطابق' دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے' وہاں انسانی تقاضوں (Human-consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا..... وہاں ترجیح ''فارمز کے پر کرنے'' کو دی جاتی ہے' انسانی زندگی کو نہیں اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب واضطراب اور عدم سکون واطمینان ہوتا ہے۔

☆☆☆

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ انداز عمل' ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو' ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیّات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان کے گھر کی زندگی بھی ''بابو آنہ'' بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:

(Un-Touched by Hand During Manufacture)

ان کے بنانے میں ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل (Robots) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں۔ (۱) جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو' تو دوسرے انسانوں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں لوچ کیسے

(۱) ان میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں جو اس جہانِ سنگ وخشت میں ذوقِ لطیف اور حسیّات انسانی کو برقرار رکھتے ہیں لیکن ایسا کرنے میں انہیں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا اندازہ باہر کا آدمی کم لگا سکتا ہے۔

آ سکے گی۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ

بملا زمان سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے

''نوائے دل گداز'' سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ''جہاں گیری'' تو ایک طرف' جب یہ کرسی چھوڑ کر ریٹائر ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ ''یوسفِ بے کارواں'' کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔

انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اٹھتے ہیں تو دفتروں کا رخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اس کے پاس کبھی اس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آ جاتے ہیں۔ میرتقی نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ

ترے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا!

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابل رحم ان کی ایک اور حالت ہوتی ہے۔ ریٹائر ہوتے ہیں تو ''فتوحاتِ بالائی'' کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے' وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے' لیکن پنشن اسی دن نہیں مل جاتی اسے منظور کرانے کے لئے دنوں مہینوں سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بت ہیں جنہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی انہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے اور انہیں بھی کسی کے حال زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرض مند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد وضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر یہ رسوم پرستی اور رہی گل کھلاتی ہے۔ الدین زندگی کے حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر وعمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے جسے الدین نے متعین کیا

ہے۔اور وہ مقصد ہے۔ما ینفع الناس..... (13:17) ''جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو''۔ اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما ہوتی ہے' اور اس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔لیکن مذہب میں اس کی آزادی اور خود فیصلہ لینے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔آپ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے۔اس میں انسان کے ایک ایک قدم کے لئے متعین ''شرعی احکام'' منضبط ملیں گے۔بیٹھو اس طرح۔اٹھو اس طرح۔چلو اس طرح۔سوؤ اس طرح۔کھاؤ اس طرح۔ پیو اس طرح۔غسل اس طرح کرو۔بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعد وضوابط ہوں گے۔ان قواعد وضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد' ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔نتیجہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ ان احکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ عبوساً قمطریراً..... قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رو سے تمہارا نان ونفقہ تو میرے ذمے ہے' علاج معالجہ نہیں۔اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔اس قسم کی بن جاتی ہے ''فطرت'' ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔پھر چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں۔اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہو جاتا ہے۔وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق وفاجر' جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔اس سے وہ عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے' نہ انسانیت کی لچک۔بیوروکریٹک کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔جس طرح ان کے ہاں (D.F.A) اور (P.U.C) کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں ہوتا' ان کے ہاں بھی ساری زندگی ''مکروہ اور مباح'' کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے۔اور ان کے فتوؤں میں انسانی زندگی کہیں بار نہیں پاتی۔یہ انسان نہیں' قرآن کے الفاظ میں ''خشب مسندہ'' بن کر رہ جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید امتیاز احمد

قرآن اور سائنس

8 فروری 1600ء کا دن تھا جب اطالوی فلسفی، ماہر فلکیات اور ریاضی دان برونو کو ایک کلیسائی احتسابی عدالت نے سزائے موت سنا دی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد گیلیلیو بھی دس پادریوں پر مشتمل ایک ایسی ہی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ یہ واقعہ 12 اپریل 1633ء کا ہے۔ گیلیلیو کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہو چکی تھی، سو اس کے بڑھاپے پر رحم کھایا گیا اور اسے سزائے موت نہ دی گئی تاہم اسے اپنے ''لغو'' نظریات کو سرِ عام غلط قرار دے کر ان سے توبہ کرنی پڑی۔ وائی کلف بیچارہ سب سے بُرا رہا۔ اس نے کسی وقت زمین کو چند کروڑ برس پرانا قرار دے دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد ایک پادری صاحب نے بائبل میں دی گئی معلومات کی مدد سے حساب لگایا تو یہ عرصہ چند ہزار برس نکلا۔ وائی کلف کو اپنے کہے کی سزا بعد از مرگ بھگتنی پڑی۔ اس کی ہڈیاں ریزہ ریزہ کر کے سمندر برد کر دی گئیں۔ لیکن یہ صورتحال مسلسل برقرار نہیں رہ سکتی تھی، ردعمل بھی لازم تھا چنانچہ جب 1859ء میں ڈارون کی Origin of Species سامنے آئی تو جملہ کارپردازان مذہب سوائے تیوریاں چڑھانے اور فتاویٰ تکفیر جاری کرنے کے کچھ نہ کر سکے کیونکہ اب عوامی حمایت سائنس کے ساتھ تھی۔ چارلس ڈارون کے نظریات کو عالمگیر قبولیت عامہ حاصل ہوئی لیکن اس قبولیت کا سبب ان نظریات کے حق میں موجود دلائل کی مضبوطی نہیں تھی بلکہ وہ نفرت تھی جو کلیسا کے خلاف دلوں میں جمع ہوتی رہی۔ کسی زمانے میں اگر سائنسی حقائق کو مذہبی عقائد کی مدد سے پرکھا گیا تھا تو اب مذہبی عقائد کو سائنسی نظریات کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کچھ لوگوں نے تو مذہب کو مستقلاً خدا حافظ کہا اور بیشتر اگرچہ مذہب سے دستبردار تو نہیں ہوئے لیکن ''ذاتی معاملہ'' قرار دے کر مذہب کو پس منظر میں ضرور بھیج دیا۔

گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اور سائنس کی جنگ میں سائنس فتحیاب ہوگئی۔ لیکن کیا یہ جنگ واقعی مذہب اور سائنس کے مابین تھی؟ گو بظاہر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے مگر

درحقیقت یہ مناقشت سائنس اور رومن کیتھولک کلیسا کے درمیان تھی۔ رومن کیتھولک مسیحی علماء بائبل کو منزّل من اللہ اور خطا سے محفوظ باور کرتے اور کرواتے تھے۔ مجموعی طور پر ان کے نزدیک بائبل کے کسی جزو کا ردعمل مسیحیت کے مکمل انکار پر منتج ہوسکتا تھا لہٰذا انہوں نے بائبل کے کسی جزو کا انکار کرنے والوں سے وہی سلوک کیا جو ان کے نزدیک کامل ارتداد کی صورت میں روا تھا.....۔۔۔۔

یہ تمام بحث اپنی جگہ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس صورتحال کو تمام مذاہب اور ہمارے نقطۂ نظر سے اسلام پر منطبق کرنا درست ہوگا؟

تمام مذاہب کے حوالے سے بات کی جائے تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی اور اگر اسلام کی بات کریں تو شاید درج ذیل قول مکمل صورتحال کی اجمالاً وضاحت کے لئے کافی ہوسکتا ہے:

نظام کائنات اللہ تبارک و تعالیٰ کا فعل ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ و تبارک کا قول ہے اور اللہ کے قول و فعل میں تضاد ممکن نہیں۔

مسلمانوں کا رویہ مجموعی طور پر انتہائی مثبت رہا ہے۔ انہوں نے اپنے دورِ عروج کے دوران جملہ علوم و فنون میں انتہائی ترقی کی لیکن انفس و آفاق سے متعلق ان کے علم میں ہونے والا اضافہ خالق کائنات پر ان کے ایمان کو متزلزل کرنے کا سبب نہیں بنا۔

البتہ ہم یہاں اتنا ضرور کہنا چاہیں گے کہ آج مغربی دنیا میں مذہب اور سائنس کے درمیان جاری کشاکش اور اس کے نتائج و عواقب میں مسلمان علماء کے لئے کچھ نہ کچھ سبق ضرور موجود ہے۔ دین اسلام اور قرآن مجید یقیناً سائنسی علوم کے مخالف نہیں لیکن مسلمان علماء تقلیدِ جامد کا شکار ہو کر وقتاً فوقتاً ایسے رویوں کا اظہار ضرور کرتے رہے ہیں جن کی مماثلت ازمنۂ وسطیٰ کے **کلیسائی رویوں** کے ساتھ نظر آتی ہے۔

ہمیں قرآن مجید جیسی نعمت عطا کی گئی ہے جس کی روشنی ہر دور میں الحاد و گمراہی کے اندھیروں سے بچا سکتی ہے۔ سائنسی تحقیقات و انکشافات قرآن کی تائید و توثیق کرتے ہیں اور قرآن سائنسی علوم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہمیں اس نعمت عظمیٰ کی قدر کرنی چاہئے اور قرآن کی قدر کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کیا جائے یعنی قرآن کو پڑھا جائے۔ سمجھا جائے۔ اس میں تدبر و تفکر کیا جائے۔ اس کے احکامات پر عمل کیا جائے اور اس کا پیغام پورے عالم انسانیت تک پہنچایا جائے۔ حدیث، فقہ، تصوف، کلام سب قرآن کے خادم ہیں انہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن کے مساوی قرار دے کر ہم بھی اسی صورتحال کا شکار ہو سکتے ہیں جس کا سامنا آج کیتھولک کلیسا کو ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

وجود باری تعالیٰ کے دلائل

میرے محترم جناب عبدالصمد صاحب نے لندن سے ای میل پر اطلاع دی کہ جب وہ اپنے بیٹے کو کہتے ہیں کہ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ تو ان کا بیٹا یہ اعتراض کرتا ہے کہ کائنات کو تو خدا نے پیدا کیا، لیکن خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے، اس سلسلے میں وہ وجودِ باری تعالیٰ کے دلائل کے خواہشمند ہیں۔

قبل اس سے کہ اصل مضمون شروع کیا جائے عبدالصمد صاحب کے صاحبزادہ کے اعتراض کے متعلق عرض ہے کہ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصود جواب حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ محض مخاطب کو لاجواب کرنا اور الجھانا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جب صدر اسلام کے بعد بحث مباحثوں کا دور شروع ہوا، تو اس میں اسی طرح کے لاطائل سوالات کئے جاتے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات سے باہر نکال سکتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ اتنا بڑا پتھر بنا سکتا ہے کہ خود بھی اس کو نہ اٹھا سکے۔ اس نوعیت کے بے شمار سوالات ہمارے علمِ الکلام کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ جن کا جواب دیا ہی نہیں جا سکتا اور یہ محض Mental Gymnastic ہی ہے۔ اسی قسم کا سوال جناب عبدالصمد صاحب کے صاحبزادے کا ہے۔ اس کا علمی جواب تو بعد میں آتا ہے سرِ دست صرف الزامی جواب پیش کیا جا سکتا ہے کہ آپ کو ایک نہ ایک چیز کو خود وجود میں آنا تسلیم کرنا پڑے گا۔ جو لوگ کائنات کا ازخود پیدا ہونا تسلیم کرتے ہیں وہ وجودِ باری کے منکر ہیں لیکن جب آپ کائنات کے لئے یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ وہ ازخود پیدا ہو سکتی ہے اور Life خود بخود وجود میں آ گئی، تو آپ یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ خدا خود وجود میں آ گیا۔ خدا کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ ذات جو خود وجود میں آ جائے۔ اب اس کے علمی جواب کی طرف آتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود تو ہر مذہب کے پیرو تسلیم کرتے ہیں۔ مذہب کا تو سارا دارومدار ہی اللہ تعالیٰ کے وجود سے وابستہ ہے۔ اس لئے وجودِ باری تعالیٰ کے دلائل مہیا کرنا صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہے۔

سارے مذاہب نے اس بارے میں دلائل فراہم کئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ پر ایسے مسکت دلائل جو انسان کو بالکل مطمئن کر دیں عقل کے بس کی چیز نہیں ہے کیونکہ اعتراض بھی عقل ہی کرتی ہے۔ عقل کے اعتراضات کا مداوا عقل سے نہیں ہوسکتا۔ عموماً جس قدر بھی دلائل اس بارے میں دیئے گئے ہیں وہ محرک اول یا علت العلل پر جا کر منتہیٰ و منتج ہو جاتے ہیں اور اسی پر آ کر ان کی تان ٹوٹتی ہے۔ ہمارے ہاں مسلمانوں نے عقلی دلائل کو ناکافی گردانا۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی شریف میں لکھا کہ:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود
گر بہ استدلال کارے دین بُدے
فخرِ رازی راز دار دین بُدے

عقل کی اس خامی اور کمزوری کی وجہ سے مسلمان مفکرین نے تصوف کی راہ اختیار کی۔ ہمارے صوفیائے کرام کا یہی خیال ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لئے عقلی دلائل کافی وحتمی نہیں ہوتے اور معرفت باری تعالیٰ صرف طریقت کے راستے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ شریعت کے بس کا کام ہی نہیں ہے لیکن اس میں دقت اور خامی یہ ہے کہ جو مشاہدات Religious Experiments صوفی کو حاصل ہوتے ہیں، وہ ان مشاہدات میں دوسروں کو شریک نہیں کرسکتا اور یہ ؎ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخداتانہ چشی

کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ان کے نزدیک کائنات کی ہر شے میں وجود باری تعالیٰ کی دلیل موجود ہوتی ہے۔

ہر گیاہے کہ از زمین روید
وحدہٗ لا شریک می گوید

لیکن یہ صورت معرفت الٰہی حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

یورپ جب از منہ مظلمہ Dark Ages سے نکلا تو ان کے ہاں بھی وجودِ باری تعالیٰ پر سوچ بچار کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے ہاں زیادہ پریشانی یہ ہوئی کہ ان کی مذہبی کتابیں توریت وانجیل عقل کا بالکل ساتھ ہی نہیں دے رہی تھیں، ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد عقلِ انسانی ان کو وحی الٰہی تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اس دور کی پیشوائیت Ecclesiatical order علم سے تہی ہونے کے علاوہ سیرت وکردار کے اعتبار سے بھی بہت پست معیار پر تھی، اور نہایت تنگ نظر اور متعصب تھی، جس نے مذہب کی گرفت اس قدر سخت کر دی تھی کہ غور وفکر کا دروازہ بالکل بند کر دیا تھا۔ اس لئے وہاں کے مفکرین مذہب کے بالکل خلاف ہو گئے لیکن ان آزاد خیال مفکرین کی کمزوری یہ تھی کہ وہ وجودِ باری تعالیٰ سے انکار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی پرورش ہی ایسے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی کہ وہ وجودِ باری تعالیٰ سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی راہ Deism میں نکالی۔ اس تحریک کا

نظریہ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کو تو مانتے تھے' لیکن وحی کے منکر تھے۔ اس زمانے کے مفکرین نے اس تحریک میں پناہ لی۔ اگر کسی صاحب کو اس تحریک سے متعلق مزید معلومات درکار ہوں تو وہ Google پر جا کر Deism تلاش کر لیں۔ ان کے لئے ایک نئی دنیا وا ہو گی اور بہت تفصیل سے اس تحریک کا تعارف مل جائے گا اور اس کے پیروؤں کی فہرست بھی معلوم ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ اس دور میں کچھ مفکرین اپنے آپ کو Agonistic یعنی ''لا ادریہ'' کہتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ حضرات نہ خدا کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اقرار۔ مشہور فلسفی مفکر برٹرینڈ رسل Agnonistic تھا۔ وہ ایک مرتبہ جب امریکہ گئے تو وہاں کے جوان پروفیسروں نے ان سے یہ سوال کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں یا نہیں تو انہوں نے یہی کہا کہ میں Agnonistic ہوں' خدا کا انکار تو نہیں کرتا' لیکن اس کو مانتا بھی نہیں کیونکہ اس کے لئے Sufficient Evidence نہیں ہے' انہوں نے یہی الفاظ استعمال کئے تھے۔

ہمارے نزدیک وجودِ حضرتِ باری تعالیٰ ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر قرآن کریم کو وحی الٰہی ثابت کر دیا جائے تو وجودِ باری تعالیٰ از خود ثابت ہو جاتا ہے اور یہ نسبتاً آسان راستہ ہے۔ اگر کسی نے ضد ہی اختیار کر لی ہو' تو یہ دوسری بات ہے ورنہ قرآنِ کریم کو وحی الٰہی ثابت کرنا قطعاً کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ گذشتہ زمانہ میں جب علومِ انسانی کو اس درجہ ترقی نہیں ہوئی تھی' اس وقت قرآن کا وحی الٰہی ثابت کرنا' اس درجہ آسان نہیں تھا' جس درجہ آج آسان ہے۔ یہ تو سامع وقاری کے مبلغ علم پر منحصر ہے۔ سامع یا خواننده کا مبلغ علم جس درجہ اعلیٰ ہو گا' اسی قدر اس کے سامنے قرآن کو وحی ثابت کرنا آسان ہو گا۔ میرا ایک مختصر سا مضمون 'اعجاز القرآن' طبع ہوا تھا جس میں قرآن کریم کو وحی الٰہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کا Response بھی بہت اچھا آیا تھا اگر کسی صاحب کو قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کے دلائل مطلوب ہوں تو ان کے حکم پر ان دلائل کو پیش کر دیا جائے گا کیونکہ اس مضمون کا یہ موضوع نہیں ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ کے ثبوت کا دوسرا طریقہ قرآن کریم کے نظام کو عملاً جاری کرنے سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ طریقہ چونکہ فکری ونظری نہیں ہے بلکہ عملی ہے اس لئے اس سے بہتر ثبوت اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ علمی وفکری ثبوت صرف چند لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں' لیکن ایسا عملی ثبوت جو سب کے سامنے عملاً موجود ہو وہ ہر شخص کو متاثر کرتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے نظام کے کچھ نتائج برآمد ہونے کے دعاوی کئے ہیں۔ اگر اس نظام کے وہ دعاوی برآمد ہو جائیں تو اس نظام کے منجانب اللہ ہونے کا اس سے

بڑا اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ کریم نے فرمایا کہ اس نظام کے ذریعے ہر شخص کو رزق ملے گا (6/151, 11/6) اگر اس نظام میں ہر شخص کو رزق مل جائے تو یہ نظام یقیناً منجانب اللہ ہے۔ قرآن کریم نے وعدہ فرمایا کہ اگر تم اس نظام کو جاری کرو گے تو تمہیں غلبہ حاصل ہو گا۔ (24/35,3/141,58/21,3/149) قرآنِ کریم نے فرمایا کہ تم اس نظام پر عمل کرنے سے ایک ایسی امت بن جاؤ گے کہ تم تمام انسانیت کے نگران ہو گے اور تمہارا مرکزی نظام تمہاری نگرانی کرے گا 2/143 اس نظام پر عمل کرنے کی وجہ سے تم وہ قوم ہو گے جو اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی 28/22' یہ چند وعدے جو تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے علاوہ بے شمار وعدے قرآنِ کریم نے فرمائے ہیں۔ اگر وہ تمام وعدے اس نظام کے ذریعے پورے ہونے لگیں تو یہ نظام یقیناً منجانب اللہ ہوگا اور اس سے وجودِ باری تعالیٰ از خود ثابت ہوگا اور یہ نظام خود اپنی زبان سے آپ کو جناب باری تعالیٰ کے وجود کی شہادت دے گا اور اس نظام کی ہر شق اپنی زبان سے پکار رہی ہوگی:

و فی کُلِّ شئیٍ لَہ' آیۃ'
یَدُلُّ علَی اَنَّہ' واحد

(مفہوم) (نظامِ خداوندی کی) ہر ہر شق میں اللہ کے وجود کی نشانی موجود ہے' اور اس کا نظام ہی یہ بات ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ واحد ہے۔

قرآنی نظام کے علاوہ وجود جنابِ باری تعالیٰ کے ثبوت کے لئے جس قدر دلائل ہیں وہ سب نظری وفکری ہیں' جو دلائل اس درجہ مستحکم نہیں ہیں جو عملی طور پر نظام کی وجہ سے سامنے آتے ہیں۔

قطع نظر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے اقرار سے ایک حقیقت ثابتہ کا اقرار ہوتا ہے اور اس کے انکار سے ایک حقیقت کا بطلان ہوتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماننے سے یا نہ ماننے سے فائدہ یا نقصان کیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ماننے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ماننے والا وحی کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ Deist حضرات کو اللہ تعالیٰ کے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود وحی کو نہیں مانتے۔ ہمارے صوفیاء کرام اللہ تعالیٰ اور وحی کو مانتے ہیں لیکن وہ وحی کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنے کے قائل ہیں اور اپنے دعوے کے مطابق انہوں نے علم حاصل کیا بھی۔ ہم سب جمہور مسلمان اللہ تعالیٰ کو ماننے کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی کے بھی قائل ہیں اور اس وحی پر انفرادی طور پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔ مذہب میں وحی کی اطاعت انفرادی طور پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے نتائج سامنے نہیں آتے۔ مذہب کی سطح تک' خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو' وحی اخلاقیات تک ساتھ دیتی ہے۔ کیونکہ وحی کے بغیر اخلاقیات کی کوئی بنیاد قائم نہیں ہوسکتی اگرچہ مذہب کی سطح

تک وحی اس کام آ جاتی ہے لیکن وحی سے جو بھرپور فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ صرف دین کی سطح پر ہوتے ہیں، دین کی سطح پر اس وحی کے اجتماعی اتباع کے نتائج بھی سامنے آ جاتے ہیں، اور اس سطح پر وحی پر عمل بھی اجتماعی طور پر نظام کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ دین میں وحی دنیاوی اور دینی دونوں مقاصد حاصل کرتی ہے۔ وحی کے اتباع کا یہ نتیجہ کہ اس دنیا میں غلبہ واقتدار حاصل ہو جائے وحی کے اتباع کا یہ نتیجہ کہ رزق فراوانی سے مہیا ہو جائے، اتباعِ وحی کے یہ سارے نتائج یہ دنیاوی مقاصد کا حصول، دین میں حاصل ہوتا ہے۔ مذہب میں نہیں ہوتا۔ جوں جوں وحی کے اتباع کے دعاوی پورے ہوتے جائیں گے، وجودِ باری تعالیٰ سبحانہٗ کے دلائل ازخود مہیا ہوتے جائیں گے۔

صاف آئے گی نظر صانعِ عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھ، آئینۂ فطرت کے سِوا

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

تزکیہ

تزکیۂ نفس، تصوف کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ اس سے مراد ہوتی ہے کہ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے انسانی خواہشات اور جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ چیزیں روحانی ترقی، کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ''روحانیت یا روحانی ترقی'' قرآنی اصطلاح نہیں ہے، یہ بھی تصوف ہی کی اصطلاح ہے۔ اس کی رو سے عقیدہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی (انسانی ذات) درحقیقت، ذاتِ خداوندی کا ایک جزو تھی جو کسی طرح الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں آن پھنسی ہے۔ اسے مادی آلائشوں سے پاک وصاف کر دیا جائے تاکہ یہ پھر اپنی اصل کے ساتھ جا کر مل جائے۔ اہل تصوف کے ہاں یہ انسان کی روحانی ترقی کا منتہیٰ ہے اور انسانی ذات کو اس طرح مادی آلائشوں سے پاک اور صاف کرنا، تزکیۂ نفس یا نفس کشی کہلاتا ہے۔ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ تصوف کا تو لفظ تک قرآن کریم میں نہیں آیا۔ قرآنی تصور یہ ہے کہ خدا کی طرف سے انسان کو ایک خاص جوہر عطا ہوا ہے جسے نفس انسانی یا انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ یہ جوہر اپنے اندر عظیم ممکنات رکھتا ہے لیکن انسان کو ملتا ہے، غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو موجودہ زندگی میں اس کا مظاہرہ بلندیٔ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کی شکل میں ہوتا ہے اور اس سے انسان، اس زندگی سے اگلی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما، ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے جو قرآن کریم میں دی گئی ہیں اور ایسا کچھ قرآنی معاشرہ میں ہی ہو سکتا ہے۔ انسانی ذات کے اس طرح نشوونما پا جانے کو ''تزکیہ'' کہا جاتا ہے۔ اسے تصوف کی تجردگاہوں کے زہدو ریاضت کے سلوک ومراسم سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ سیدھے سادھے الفاظ میں ایک مومن ومتقی کی زندگی کا نام ہے اور چونکہ اس انداز زندگی سے انسانی ذات کو نشوونما حاصل ہوتی ہے اس لئے اسے تزکیۂ نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے چونکہ یہ حاصل ہوتا ہے قرآنی معاشرہ کے اندر زندگی بسر کرنے سے جسے سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے قائم کیا تھا اس

لئے اسے فریضۂ رسالت قرار دیا گیا۔ انسانی ذات ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ اس کی نشوونما کرنا انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ جس نے اس کی نشوونما کر لی وہ کامیاب ہوگیا۔ جس نے اسے دبائے رکھا وہ تباہ ہوگیا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى o وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى o (۸۷/۱۴۔۱۵)۔

(یادرکھو) کھیتی اسی کی پروان چڑھتی ہے (جو اپنے جسم کی پرورش ہی کو نصب العین حیات قرار نہ دے لے بلکہ اس کے ساتھ) اپنی ذات کی نشوونما بھی کرے اور ذات کی نشوونما اس کی ہوتی ہے جو خدا کی صفتِ ربوبیت کو عملاً متشکل کرتا اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کے قانون کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا o وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا o (۹۱/۹۔۱۰)۔

جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی وہ کامیاب و کامران ہوگیا۔ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ اسے زندگی کا مقصد حاصل ہوگیا۔

لیکن جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا' اس کی کشتِ حیات ویران ہوگئی۔ اس کا شعلہ زندگی افسردہ رہ گیا۔ اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں۔ وہ اس چقماق کی طرح ہوگیا جس میں آتش افروزی کی صلاحیت تو ہو لیکن اس کی چنگاری کی نمود نہ ہو سکے اور اس طرح وہ پتھر کا پتھر رہ جائے۔

''تزکیہ کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوتا ہے''

جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ جَزَاء مَن تَزَكَّى (۲۰/۷۶)۔

ان کے رہنے کے لئے ایسے باغات ہوں گے جن کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ یہ اس کا صلہ ہے جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی۔

اپنی محنت کی کمائی کو حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دینے سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی انسانی جسم کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے انسان اپنے صرف میں لاتا ہے (کھانے پینے سے) لیکن انسان کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کو دیتا ہے۔

الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى (۹۲/۱۸)۔

وہ جو عندالضرورت اپنا سب کچھ (مالہٗ) نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے دیتا ہے اور اس طرح خود اس کی اپنی ذات کی بھی نشوونما ہو جاتی ہے۔

یہ تو رہا دوسروں کی نشوونما کے لئے اپنی محنت کی کمائی کے ماحاصل (اپنا مال) دینے والوں کے لئے خدا کا مقرر کردہ اصول۔ اس کے مقابلہ میں باطل طریق سے لوگوں کا مال

کھانے والوں اور اللہ کی راہ (الدین کی راہ) میں روک بن کر کھڑے ہونے والوں کی طرف آیئے۔ ان کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ:

یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ إِنَّ کَثِیْراً مِّنَ الأَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَأْکُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّونَ عَن سَبِیْلِ اللّہِ (۹/۳۴)۔

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو (سن رکھو) احبار و رہبان (علماء مشائخ) میں سے اکثر کی روش یہ ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں (کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے)۔

سورہ ہود میں ہے کہ خدا کی راہ سے روکنے والے اور ان میں پیچیدگیاں پیدا کرنے والے اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں اور آخرالامر یہ سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے۔

أَن لَّعْنَۃُ اللّہِ عَلَی الظَّالِمِیْنَ o الَّذِیْنَ یَصُدُّونَ عَن سَبِیْلِ اللّہِ وَیَبْغُونَھَا عِوَجاً وَھُم بِالآخِرَۃِ کَافِرُونَ o ..... خَسِرُواْ أَنفُسَھُمْ وَضَلَّ عَنْھُم مَّا کَانُواْ یَفْتَرُونَ o (سورۃ الاعراف)۔

ان کے ظلم کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے خود ساختہ مسلک کو شریعتِ خداوندی کا نام دے کر، لوگوں کو خدا کے سچے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ و خم پیدا کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ مستقبل کی زندگی (حیاتِ اخروی) پر ایمان ہی نہیں رکھتے (مذہب کو انہوں نے اپنا پیشہ بنا رکھا ہے)۔ اس قسم کے ظالم رحمت خداوندی سے یکسر محروم رہ جاتے ہیں۔

ع زبر کے ساتھ عَوج کے معنی ہوتے ہیں ایسی ٹیڑھ جو نظر آ جائے۔ اور ع زیر کے ساتھ عِوج سے مطلب ہے نظر نہ آنے والی ٹیڑھ۔

ان کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ نماز و روزہ اور حج کے اغراض و غایات اور مقاصد و نتائج بیان کرنے کے بجائے، انہیں خدا کی پرستش تک محدود رکھنے کی غرض سے ان کے فضائل پہ فضائل بیان کرتے رہتے ہیں۔ سورہ توبہ کی مندرجہ بالا آیت کے دوسرے حصہ میں ان کے ساتھی سرمایہ داروں کے متعلق ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُونَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلاَ یُنفِقُونَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّہِ فَبَشِّرْھُم بِعَذَابٍ أَلِیْمٍ (۹/۳۴)۔

قرآن کریم، ان علماء مشائخ اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو جو

ان کی خود ساختہ شریعت کی آڑ میں نظامِ سرمایہ داری (مغربی جمہوریت وغیرہ) کو منشائے خداوندی کے مطابق سمجھ کر سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے الم انگیز عذاب کی خبر سناتا ہے۔

سرمایہ داروں نے آج کل الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ٹی وی چینلز کے پلیٹ فارمز پر ایک نیا ڈھنگ اختیار کر رکھا ہے۔ الدین کے بجائے عوام کا رخ مغربی جمہوریت کی طرف قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کے پروگرام مرتب کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ فرقوں کے ہوتے ہوئے الدین قائم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کبھی ٹی وی چینل پر فرقہ پرستی کی گرہوں کو ہوا دے کر مضبوط رکھنے کے لئے ایک ہی چینل پر دو مختلف فرقوں شیعہ و سنی کے مولوی لائے جاتے ہیں اور کبھی ایک مولوی اور دو دانشور حضرات کو ٹی وی پلیٹ فارم پر بٹھا کر اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے تحفظ کے استحقاق اور ذمہ داری کے بجائے ان کے ''مساوی حقوق'' (ناممکن العمل) کی بحث چھیڑی جاتی ہے۔ ٹی وی چینل والوں میں سے کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ اسلامی حکومت میں سوسائٹی کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ پر ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی سوسائٹی کا ممبر ہی نہیں تو وہ اس سوسائٹی کے نظم ونسق میں حصہ کیسے لے سکتا ہے؟ سیکولر نظامِ حکومت میں ایسا ہوتا ہے مثال کے طور پر جس طرح پاکستان میں مسٹر بھگوان داس چیف جسٹس' یا برطانیہ میں مسلم' ہندو اور سکھ حضرات کونسلر اور ایم پی وغیرہ۔

ایسے ہی ایک پروگرام سے متاثر ہو کر اچھے بھلے سمجھدار پڑھے لکھے میرے ایک دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا مغربی نظام جمہوریت بہتر نہیں ہے؟ میں نے جواب دیا کہ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ قرآنی نظام کی بدولت مومنین کی قابلِ رشک زندگی دیکھ کر کفار حسرت سے کہیں گے کہ کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے۔

رُّبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ○ (۱۵/۲)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی

اندھیری وادیوں کے مسافر

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمَم کی حیات کشمکشِ انقلاب!
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضاء میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

کراچی کے ایک بڑے ہسپتال کی ایمرجنسی وارڈ میں ایک خاتون لائی گئیں جو زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔ وہ اپنی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہی تھی۔ یہ 36 سالہ خاتون جوکہ 6 بچوں کو جنم دے چکی تھی اس ساتویں حمل کے پانچویں ماہ میں یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ وہ حاملہ ہے یہ فیصلہ کیا کہ یہ بچہ نہیں چاہیے چونکہ چھوٹا بچہ سوا سال کی عمر کا تھا اور وہ اپنی رضاعت کے مرحلے میں تھا خاتون نے کبھی مانع حمل طریقوں کا استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ اس مرتبہ اُس کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب حمل قرار پا گیا اس جوڑے نے جب یہ فیصلہ کرلیا کہ اس حمل کو گرایا جائے تو خاتون خود ہی کسی نامعلوم جگہ پر چھوٹے سے کلینک میں چلی گئیں، جہاں مختلف طریقوں سے بچے کو گرانے کے سلسلے میں کوششیں کی گئیں اور خاتون کو بلا آخر یہ کہا گیا کہ آپ جا سکتی ہیں آپ کا کام ہوگیا ہے۔ اب چونکہ اُن آلات کی وجہ سے بچے کو نقصان پہنچایا گیا تھا تو یہ بچہ جوکہ پانچ ماہ کا مکمل اعضاء کے ساتھ بنا ہوا تھا گرا تو بالکل نہیں البتہ پیٹ میں مرگیا۔ چونکہ بچے کی حرکت بند ہوگئی تھی لہٰذا خاتون نے سمجھا کہ بچہ ضائع ہوگیا ہے۔

رات کو بیوی نے یہ خوشخبری خاوند کو سنائی کہ حمل ضائع کروادیا ہے اور یہ خاندان پُرسکون سوگیا۔ چھوٹا بیٹا جوکہ سوا سال کا تھا اپنے والد کے ہمراہ سویا ہوا تھا صبح مردہ حالت میں پایا گیا۔ یعنی ہنستا کھیلتا بچہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوگیا یہ خبر قیامت بن کر ان پر نازل ہوئی۔ ماں تو تین چار روز تک حواس باختہ تھی اُس کو الٹیاں، بخار، پیٹ میں درد نے جب نڈھال کردیا تو خاتون کے مجازی خدا نے ایک قریبی ہسپتال میں لے جا کر دکھایا جہاں انہیں خبر ملی کہ پیٹ میں

بچہ مردہ حالت میں موجود ہے جسکا زہر خاتون کے خون میں سرایت کر رہا ہے لہٰذا اُس کو پہلے ضائع کیا جائے گا اور بعد میں آلات کی مدد سے صفائی کا عمل دُہرایا جائے گا۔ اسی اثناء میں یہ کہانی اپنی بدترین انجام کی طرف بڑھنا شروع ہوئی۔

ڈاکٹروں نے کافی محنت کی اور مہنگی ادویات کا استعمال شروع کیا لیکن خاتون ان دوائیوں کی حدود سے نکل کر بہت آگے جا چکی تھیں لہٰذا حالت مزید خراب ہوئی تو شوہر نے فیصلہ کیا کہ کسی بڑے اسپتال میں مریضہ کو منتقل کرنا چاہیے۔ اس دوران موت خاتون کے سرھانے آ کھڑی ہوئی۔

بڑے ہسپتال میں مریضہ کو ایمرجنسی وارڈ میں لایا گیا جہاں سے جلد از جلد انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں شفٹ کیا گیا تا کہ فوری علاج شروع کیا جائے با الفاظ دیگر ہر ممکن صورت سے علاج شروع ہوا۔ خاتون کی حالت نازک تھی شوہر کی حالت زار یہ تھی کہ کسی طرح سے بیوی کو واپس لوٹایا جا سکے زندگی کو لوٹانا تو کسی انسان کے بس کی بات نہیں، تسلی کے الفاظ بھی کہاں سے لاتے ہم نے کہا کہ آخری حد تک کوشش کریں گے لیکن زندگی تو انعام خداوندی ہے کسی انسان کے بس میں نہیں۔ مریضہ جس حالت میں لائی گئی تھی اس حالت کو میڈیکل اصطلاح میں septicemia کہتے ہیں۔ خون میں زہر آلود مادوں کی شمولیت کی وجہ سے گردے، جگر، پھیپھڑے، بُری طرح متاثر ہوئے تھے، سانس کی مشین کی مدد بھی ناکافی تھی، دو دن کی ہر ممکن کوشش کے باوجود مریضہ کے دل کی دھڑکنیں بالآخر ڈوبتی چلی گئیں۔ تمام اسٹاف اور ڈاکٹرز پریشان تھے کے اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی اُس ماں کو دنیا کی رونق میں نہیں لا سکے تھے۔ پانچ بچے ممتا سے محروم اور ایک گھر ویران ہوگیا۔ اس خاندان کو ایک غلط فیصلے کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی یہ تو شاید ان سب لوگوں کے لیے مقامِ عبرت ہے جو وقفہ کا مطلب اسقاطِ حمل ہی سمجھتے ہیں۔

زندگی کی قدر کیجئے یہ بار بار نہیں ملا کرتی، زندگی اللہ کا دیا ہوا ایسا انعام ہے جس کی حفاظت خود جانداروں کی جبلّت میں شامل ہے، حکم ربی ہے کے جس نے ایک زندگی کو بچایا گویا اس نے پوری انسانیت کو بچالیا۔ ان حقیقتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کے اکثر اوقات ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں جن میں نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ معصوم زندگیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔

ایک نئی زندگی کا اس دنیا میں پہلی سانس سے آخری سانس تک کا سفر کس طرح رونما ہوتا ہے وہ خالقِ کائنات کے علم میں ہے لیکن اس زندگی کو کس طرح دنیاوی خطرات سے بچنا ہے یا بچانا ہے اس کے لیے مفید اصول متعین کر دیئے گئے ہیں۔ جیسے کہ اگر انگلی آگ میں ڈالو گے تو جل جائے گی یہ نتیجہ تو فوراً برامد ہو جاتا ہے اس کے لیے

کسی خارجی قانون کی ضرورت نہیں' نہ عدالت چاہیے نہ پولیس اسی طرح نئی آنے والی زندگی کی شمع گل کرنے کے لیئے جب کسی بھی مہربان سے رابطہ کریں گے تو اس کا نتیجہ ماں کی زندگی کی شمع گل کرنے پر بھی منطبق ہوسکتا ہے کیا یہ کسی نے کبھی سوچا ہے؟

ہماری زندگی ایسی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے جس میں اسقاط حمل کے واقعات کے خطرناک مراحل سے گزرنے کے بعد ماں یا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور پیچھے درد کی پرچھائیاں خاندان بھر کیلئے چھوڑ جاتی ہے یا پھر ایک عرصے تک تکلیف دہ بیماریوں سے نبرد آزما ہوتی ہے۔

تعلیم وصحت کی اہمیت کا دیگر اقوام عالم نے بھی کافی پرچار کیا لیکن جن اقدار پر مستحکم انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی جاتی ہے اُس کو انہوں نے اپنے مذہب کی دقیانوسی روایات سمجھ کر اپنی زندگیوں سے خارج کر دیا۔ وہ اقدار خاص طور پہ جن پر خاندانی نظام کا انحصار ہوتا ہے۔ اولاد کی بہترین تربیت اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے سے نہیں ہوا کرتی وہ والدین کی گود سے حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنی اولاد کی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے ہوے اُن کی تعمیر وترقی کے لیے جان و دل سے کوشاں رہتے ہیں۔ جب وہ تربیت گاہ چھین لی جائے گی تو معاشرے میں تعلیم تو عام ہوگی مگر تربیت سے خالی انسانی معاشرے کی کھوکھلی عمارت نظر آئے گی۔ مغرب نے اپنے کندھوں سے مذہبی اقدار یا انسانی اقدار کا بوجھ بہت پہلے اُتار پھینکا تھا جس کے بعد زندگی کے مختلف نظریات لیے ہوئے بہت سے اسکالر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی سوچ کے مطابق دنیائے ارض کے انسانوں کی گروہ بندی شروع کر دی۔ زمینی پیداوار و گنجائش اور آبادی کے تناسب کا اندازہ کرتے ہوئے اٹھارویں صدی عیسوی میں ماہرِ معاشیات نے انگلستان میں ایک مفروضہ پیش کیا۔

مالتھوس کا خیال تھا چوں کہ زمین پر رہنے کی جگہ محدود ہے معیشت کے وسائل بھی محدود ہیں لیکن اَفزائشِ نسل انسانی غیر محدود ہے اگر یہ پیداوار اسی طرح بڑھتی رہی تو زمین انسانوں کیلئے ایک دن تنگ ہو جائے گی وسائلِ معاش کفالت نہ کرسکیں گے یوں نتیجتاً معیارِ زندگی پست ہوتا چلا جائے گا نسل انسانی کی خوشحالی' آسائش اور فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ اس کی افزئش نسل و وسائل کا معیشت کے ساتھ توازن برقرار رہے' اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کچھ تجاویز بھی پیش کیں مثلاً بڑی عمر میں شادی کی جائے اور ازواجی زندگی میں ضبطِ نفس سے کام لیا جائے ان خیالات کا اظہار پہلی مرتبہ ۱۷۹۸ عیسوی میں اس نے اپنے ایک رسالے میں کیا جسکا عنوان تھا۔

An essay on population & its effects on the future improvement of Society.

ابتداً اہلِ مغرب نے اس نظریہ کو یکسر نظر انداز کر دیا لیکن ۵۷ سالوں میں آبادی کے تناسب میں دگنے اضافے کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں یہ تحریک نئے سرے سے اُٹھی اور Neo Malthasiain movement کہلائی۔ ۱۸۸۱ میں یہ تحریک پھیلتے پھیلتے انگلینڈ سے ہالینڈ' بیلجیئم' فرانس اور پھر جرمنی تک جا پہنچی۔ رفتہ رفتہ تمام یورپ اور امریکہ کے متمدن ممالک میں پھیل گئی با قاعدہ انجمنیں قائم ہوئیں جہاں ضبطِ ولادت کے فوائد اور عملی طریقوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ ان طریقوں کو ہر طرح سے ذہن نشین کروایا گیا۔ داوئیاں ایجاد کی گئیں آلات بنائے گئے۔ میڈیکل پروفیشنز کو تربیت دی جانے لگی۔ سوشل ورکرز' ہیلتھ ورکرز' بہبود آبادی کی تنظیموں نے اس پودے کی آبیاری کی اور اس کے لیے جگہ جگہ Birth control clinic قائم کیے گئے۔ جہاں ماہرانہ مشورے دیے جاتے ادویات عام آدمی کی دسترس تک پہچانے کا انتظام کیا گیا۔ اس جدوجہد کو آگے بڑھانے میں چند اور محرکات بھی شامل تھے۔ جس میں انیسویں صدی کا صنعتی انقلاب بھی شامل ہے۔ عورتوں میں معاشی جدوجہد اور جدید تہذیب وتمدن کا فروغ جس سے خاندانی نظام متاثر ہوا۔ نئے حکومتی قوانین بنائے گئے تاکہ عورت گھر کے نظام خانہ داری سے باہر آکر بے باکی اور آزادانہ زندگی گزار سکے۔ بچوں کو گورنمنٹ کی طرف سے آزادی اور سرپرستی حاصل ہو اور وہ جب جوانی کی حدود میں داخل ہوں تو خاندانی بندھنوں سے آزاد ہو کر ملکی ترقی کے لیے سوچیں جن کو آزادی جنسیات تو حاصل ہو جائے لیکن گھریلو ذمہ داریوں یعنی تولید و پرورش نسل سے بری الذمہ کر دیا جائے بالاخر ارباب اقتدار' سیاسی و معاشی ماہرین کی کاوشوں سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گیا جس میں والدین اولاد کو اپنی خوشیوں اور ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روکاوٹ سمجھنے لگے یوں اس معاشرے سے انسانی اقتدار کو رخصت کر کے ایک انسان نما حیوانی معاشرے کی داغ بیل ڈالی گئی۔

اب اہل مغرب نے ان کھوکھلی بنیادوں پر استوار عمارت کا نقشہ اقوام عالم کو دکھایا ظاہری چمک دھمک اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والی تہذیب کے ذریعے باقی دنیا کو اپنی ترقی و آزادی حقوق نسواں کے کھوکھلے نعروں سے بیوقوف بنانا شروع کر دیا۔ مانع حمل ادویات کا استعمال بے دریغ و بے محل ہونے لگا۔ اسقاطِ حمل سے ماؤں کی شرح اموات میں اضافہ ہوا جنسی بیماریوں اور بے راہ رویوں' دماغی بیماریوں کے اضافہ کے باعث یہ انقلاب ڈیڑھ سو سال کی کاوشوں کے بعد بام عروج پر پہنچا۔

اس انقلاب کا اثر اسلامی ممالک نے کافی تردّد کے بعد قبول کیا لیکن قوانین کی رو سے اسقاطِ حمل ایک جرم قرار دیا۔ جو کہ آج بھی نافذ العمل ہے۔ مانع حمل ادویات کا استعمال چند ناگزیر حالات کے تحت ماؤں کی شرح

اموات کو کم کرنے کیلیے رائج کیا اولاد میں وقفہ ہوتا کہ ماں اور بچے کی صحت بہتر ہو۔

سماجی بہبود کی تنظمیں ہیلتھ ورکرز کے ساتھ ملکر شہر شہر، گاؤں، محلّہ وگلی میں صحت سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچاتی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہماری ناکامی کسی ماں کی موت کی صورت میں ہمارا منہ کس طرح چڑا رہی ہوتی ہے۔

آیئے ان حقائق کے محرکات کیا ہیں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیوں مانع حمل ادویات جن سے وقفہ بڑھایا جاسکتا ہے ان کو چھوڑ کر قتل جیسے گھناؤنے جرم میں ایک ماں یا پاکستانی عورت داخل ہوتی ہے سروے ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۳ کی رپورٹ کے اندازے کے مطابق پاکستان میں سالانہ ۸۹۰،۰۰۰ حمل ضائع کروائے جاتے ہیں جن کا تناسب زندہ پیدائش کے مقابلے میں 0.20 یعنی ایک اسقاط (Abortion) ہر پانچ زندہ پیدائش کے بعد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب چھ زچگیوں میں سے ایک کا خاتمہ اسقاط پر ہوتا ہے اندازاً قومی اسقاطِ حمل کا ریٹ 29/1000 ہے۔ یعنی تقریباً ہر عورت زندگی میں ایک بار اسقاطِ حمل سے گزرتی ہے (عمر سال 49-15) اور اندازاً 19700 عورتیں اسقاطِ کی پیچیدگیوں کے ساتھ مختلف اسپتالوں یا ہیلتھ سروس میں زیر علاج ہوتی ہیں۔ جب پاکستانی خواتین سے ایک سروے میں اسقاطِ حمل کی وجہ معلوم کی گئی تو پتا چلا کہ

۱۔ 55% خواتین کا کہنا تھا کہ اور بچہ نہیں چاہیئے (یعنی ان کے خیال سے بچوں کی تعداد مکمل ہوگئی تھی)

۲۔ 54% خواتین نے کہا کہ معاشی تنگی کے باعث مزید بچے پیدا نہیں کرسکتی (تین بچوں کے بعد)

۳۔ 25% خواتین نے کہا کہ آخری بچہ بہت چھوٹا ہے

۴۔ 22% خواتین کا مدعا یہ تھا کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے (تفصیلی رپورٹ پاپولیشن کونسل اسلام آباد Peter miller اور WHO) ان میں ناجائز غیر قانونی اسقاطِ حمل کا اندازہ و شمار مشکل ہے کیونکہ یہ عموماً چھوٹی جگہوں پر غیر محفوظ طریقوں سے کروائے جاتے ہیں جہاں جراثیم کش طریقوں سے آلات کو صاف نہیں کیا جاتا۔

امریکن جرنل آف گائینی اوبس کے مارچ 2004ء کے شمارے میں زچگی کے دوران ماؤں کی شرح اموات پر 13 سالہ تحقیق شائع ہوئی ہے جو فن لینڈ کی 49-15 سال کی عمر کی خواتین پر 2000-1987 تک کی گئی۔

جس کی رو سے اسقاطِ حمل سے متعلق اموات، زچگی کی تعداد سے 2.95% زیادہ تھیں۔

پاکستان میں اسقاطِ حمل کا قانون آرٹیکل ۲۱۳ کے تحت جو کوئی غیر قانونی اسقاط حمل کرتا ہو۔ اُسے تین سال قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔ اگر عورت

اپنے حمل کو ضائع کرنے کی کوشش کرے گی تو یہ سزا سات سال تک بھی بڑھ سکتی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے مطابق یہ قوانین دہرائے گیئے اور ۱۹۹۷ء میں مکمل نافذ العمل ہوئے۔ ان قوانین کے تحت۔

۱۔ اگر ابھی تک بچے کے اعضاء نہ بنے ہوں اسقاط جُرم ہے ماسوائے اس کے ماں کی زندگی بچانے کی غرض سے علاج کروایا جاے اس جُرم میں سزا تعزیری ہوگی (حد کے علاوہ) اگر عورت نے اسقاط کی اجازت دے دی تھی تو کرنے والے کو تین سال سزا اور اگر اجازت نہیں دی تو دس سال تک سزا ہوسکتی ہے

۲۔ بچے کے اعضاء بننے کے بعد اگر اسقاط کیا جائے تو یہ بھی جُرم ہے۔ اگر اسقاطِ حمل کیا جائے گا تو اس کی دیت ہوگی جو کے 1/10 ایک مکمل انسان کے مقابلے میں ہوگی اور اگر بچہ زندہ پیدا ہو کر کسی کی غفلت سے مر جاے تو دیت مکمل انسان کی ہوگی۔ یا سات سال کی تعزیری سزا ہوگی ان تمام قوانین کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں اسقاطِ حمل کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ جس میں دونوں طرح کے کسیز (cases) ملتے ہیں جائز اور ناجائز اسقاط حمل۔ عموماً ہسپتالوں میں ڈاکٹرز کا رویہ اس معاملے میں خاصہ سخت ہوتا ہے چونکہ یہ قانونی طور پر بھی اور شرعی حیثیت سے بھی ایک جرم ہے۔ لہٰذا اس کام کے لیے لوگ عموماً مختلف علاقوں میں بنے ہوئے کلینکس سے رجوع کرتے ہیں جن کو غیر تربیت یافتہ لوگ چلا رہے ہوتے ہیں۔

چند مریض جو مختلف complications لے کر ہسپتالوں سے رجوع کرتے ہیں تو انہی کا اعداد و شمار ہم اکھٹا کر سکتے ہیں ظاہر ہے جو کہ صحیح نہیں ہوتی۔ فیملی پلاننگ کے اداروں میں سے چند ادارے اسقاط حمل کروانے کی آفر دیتے ہیں لہٰذا کافی لوگ ان کی خدمات سے بھی مستفید ہوتے ہیں یقیناً یہ کوئی ڈھکی چھپی باتیں نہیں ہیں لیکن کبھی کسی ایک مریض کو یا سرو سز دینے والے کو قانون نے کچھ بھی نہیں کہا کوئی ایسا واقعہ جو کہ ہماری نظر سے گزرا ہو بہر حال ان تمام اسقاط کے بعد جن پیچیدگیوں سے خواتین بڑے ہسپتالوں میں آتی ہیں۔ اُن سے تقریباً تمام ڈاکٹرز کا واسطہ پڑ چکا ہوتا ہے کبھی شدید انفیکشن کے ساتھ جو خون میں پہنچ کر سارے جسم کے اندرونی اعضاء کو خراب کر چکی ہوتی ہے۔ یا آنت کا ایک ٹکڑا جسم سے باہر نکلا ہوتا ہے اور عورت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ!

ہمارے معاشرے میں مانع حمل ادویات اور دیگر طریقوں کے استعمال کے لیے بہت زیادہ معلومات نہ ہونے کی وجہ سے کافی کہاوتیں مشہور کر دی گئیں۔ ان غلط باتوں کو دُرست کرنے میں میڈیا نے کافی کوشش کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگ منصوبہ بندی کے لیے کوئی بھی طریقہ استعمال کرنے کے بجائے اس خطرناک اور جان لیواء کھیل کو ترجیح دیتے ہیں۔

انسان کا ہر عمل اس کی زندگی میں نتیجہ پیدا کرتا ہے اگر بہتری کے لیے ہوگا تو خوشگواریاں زندگی میں شامل ہونگی وگرنہ زندگی کو جہنم میں تبدیل کرنے کے لیے یہ ہی اعمال بد ذمہ دار ہوتے ہیں جیسا کہ ہم نے کہا تھا کہ یہ قانونِ خداوندی اٹل ہے اور اپنی جگہ اپنے نتائج لیے ہوئے ہے کہ آگ میں انگلی ڈالو گے تو جل جائے گی۔ کیونکہ آگ کا کام ہی جلانا ہے اور اس عمل کے انجام دینے کے لیے انسان کا اپنا اختیار وارادہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس نتیجے کے لیے کسی باہر کے قانون کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص چوری کی سزا سے بچ جائے وہ دنیاوی قانون کو دھوکا دیدے لیکن جو اثر (Effect) اُس کی ذات پر اس چوری کی وجہ سے ہونا تھا وہ تو ہوگیا اب اُس کی سزا کے تحت وہ شخص مزید اس مرض میں مبتلا ہو جائے گا اور آخر کار انجام بھی بد ہی ہوگا۔

اسقاطِ حمل جو کہ جرم بھی ہے اور اخلاقی بُرائی بھی جس کو قرآن کریم میں سختی سے منع فرمایا گیا ہے اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کس طرح سُکھ کی زندگی پا سکتے ہیں ان خواتین کی دماغی صحت کا مطالعہ کیا گیا تو اکثر اوقات احساس جرم کی شدت (جو کہ ایک انجانی کشش ماں اور بچے کے درمیان ہوا کرتی ہے اور (اُس کو ممتا بھی کہا جاتا ہے) ماں کو خودکشی کی جانب راغب کر دیتی ہے۔

کیا دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس زمین کے خزانوں کا تناسب کسی انسان کے احاطہ ادراک میں آ سکتا ہے؟ کون جان سکتا ہے کل کا سورج کون دیکھے گا اور کس سحر کی شام ہونا کس کی زندگی میں دیکھنا لکھی ہے مستقبل کی باتیں' اُن میں جھانکنے اور پیشگوئیاں کرنے کی فطرت ایک ایسے انسان کی تو ہو نہیں سکتی جو اپنی حدود اور قیود سے واقف ہو۔ یقناً ان خیالات کا اظہار لاعلم اور مافوق الفطرت لوگ کیا کرتے ہیں۔ رزق کے خزانوں کا معاملہ انسان کبھی بھی مکمل طور پر نہیں جان سکتا نہ اُس کے لیے ممکن ہے کس کی زندگی کی اسٹاپ واچ کس لمحے رُک جائے گی اُس کا علم بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا زندگی ایک نعمت ہے اس کی قدر کیجئے جو قوانینِ قدرت اٹل حقیقتوں کی صورت ہمارے اردگرد رواں دواں ہیں اُن سے مستفید ہونا عقلمندی ہے اُن سے ٹکرانے کی صورت میں پاش پاش ہو جانا مقدّر ہوتا ہے اب ایک نظر ان احکامات الٰہی پر ڈالتے ہیں جن کو ماننا اور جاننا ہم سب پر فرض ہے کیونکہ قرآن کریم تمام انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ یہ کتاب محکم صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے مسائل کا حل تجویز کرتی ہے۔ کہا گیا کہ والدین کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کریں (۱۵۱۔۶)۔(۳۱۔۱۷)

مزید فرمایا کہ اُن کے رزق کی اور خود تمہارے رزق کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہے۔

عزیزان گرامی یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ اپنی یہ ذمہ داری انسانوں سے کس طرح پوری کرواتے ہیں۔ اسلامی نظامِ معیشت اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا مجاز ہے قرآن کی رو سے اِس اُمت کے بچوں کی پرورش، تعلیم اور صحت وغیرہ کی ذمہ داری انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے یہ ماں باپ کا انفرادی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ نظام مملکت کی اجتماعی ذمہ داری ہے امت مسلمہ کے اس سنہرے دَور میں جھانکئے تو نظر آئے گا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں ہر پیدا ہونے والے بچے کا وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا جب تک کے وہ جوان ہو کے اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جاتا۔

آج مغربی ممالک نے اسلام کے اسی زرّیں اصول کو رائج کر کے اپنی قوم کو تحفظ دیا ہے۔ انگلینڈ میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی کفیل حکومت خود ہوتی ہے۔ ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے اِس قانون کو Omar's Law کہتے ہیں سویڈن، کینڈا میں بھی یہی اصول ہے بلکہ دودھ کے پیکٹ تک بچوں کو دیے جاتے ہیں جن بوڑھوں کا کوئی کفیل نہیں اُنکی ذمہ داری حکومت کے سرَ ہوتی ہے اسلام جہاں خاندانی نظام کو تحفظ دے کر مضبوط بناتا ہے وہاں حکومت کو ذمہ دار بنا کر اُس خاندان کا مددگار بناتا ہے۔ ہم چونکہ اس لذّت اپنائیت سے آشنا ہی نہیں ہوئے اور جہاں اجتماعی زندگی کا تصور ہی خواب ہے وہاں عوام الناس کو صحیح سمت پر رواں کرنا یقیناً مشکل کام ہے لیکن ناممکن نہیں۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں اِمروز نہیں ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ القلم

(آیات 7 تا 41)

عزیزانِ من! آج نومبر 1983ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القلم کی آیت 7 سے ہو رہا ہے: (68:7)۔

سابقہ درسوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہر رسول حق کا پیغام لے کر آتا تھا۔ اس کے پروگرام کی کڑیاں یوں ہوتی تھیں کہ سب سے پہلے وہ دلائل و براہان کی رو سے اپنے پیغام کو پیش کرتا تھا' دوسروں سے بھی دلائل مانگتا تھا' جو ان دلائل سے قائل ہو جاتے تھے' تو جو ضابطہ قوانین تھا' اس کا اطلاق ان پہ ہو جاتا تھا' مگر جو لوگ اسے نہیں مانتے تھے' اس کی مخالفت میں کھڑے ہو جاتے تھے' ان کے لیے مدافعانہ طور پر قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا تھا' لہٰذا ان کو روکنے کے لیے وہاں قوت استعمال کرنا پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں ہوتا یہ تھا کہ مخالفین آپؐ کو دیوانہ کہتے تھے۔ آپ ﷺ انہیں دلائل و براہین سے سمجھاتے۔ اب ظاہر ہے کہ اس پروگرام میں سب سے پہلے وہ لوگ آئیں گے جو دلائل و براہین کی رو سے اگر چاہیں تو اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں' اگر نہ چاہیں تو ان سے کہا جاتا تھا کہ تم ہمارے پروگرام میں مداخلت نہ کرو' ہم تمہارے پروگرام میں دخل نہیں دیتے' نتائج خود بتا دیں گے کہ دونوں میں کون دیوانہ اور فریب خوردہ ہے اور علی الاعلان کہتے تھے کہ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ص وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (68:7) تیرے خدا پر اچھی طرح روشن ہے کہ کون صحیح راستے پر چل رہا ہے اور کون اس راستے سے بھٹک چکا ہے۔ دونوں کو دن بھر چلنے دو' شام کے وقت جب سفر ختم ہو جائے گا تو واضح ہو جائے گا کہ کون منزل پر پہنچ گیا اور کون راستے میں کھو گیا۔ اس کے باوجود جو مقابلے میں آ کر انہیں روکتا تھا' اس رکاوٹ کو دُور کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔

ایک دوسرے انداز کی مخالفت

عزیزانِ من! اب اگلی آیتوں میں مقابلہ کرنے اور مخالفت کرنے کا ایک اور Type (اسلوب، قسم) آتا ہے۔

شمشیر تک کی بھی صورت یہ تھی کہ وہ کھلے بندوں میدان میں سامنے آتے تھے' کھلے بندوں مقابلہ ہوتا تھا۔ یہ ایک اور Type (قسم) چاہتا ہے کہ کسی طرح سے Compromise (مصالحت) کر لی جائے' مفاہمت کر لی جائے اس لیے آپ ﷺ سے کہا کہ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ o وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ❶ (68:8-9) یہ حق اور صداقت کی تکذیب کرنے والا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو چاہتا یہ ہے کہ کچھ تم جھکو' کچھ وہ جھکیں' کچھ تم پیچھے ہٹو' کچھ وہ آگے بڑھیں۔ یہ وہی ہے جسے مفاہمت یا Compromise کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی وارن (Warn۔ متنبہ) کیا ہے۔ امتِ مسلمہ کو بتایا ہے کہ یہ بڑے خطرناک قسم کا گروہ ہوتا ہے۔ اب عام طور پہ آپ دیکھیں گے کہ کشمکش میں کوئی بھی ہو' اس میں یہ مقام آتے ہیں' Compromise (مفاہمت) ہوتا ہے لیکن یہاں یہ ہے کہ ان کی اِس بات کو قطعاً نہ ماننا' وہ اس لیے کہ:

باطل دُوئی پسند ہے' حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

حق پہلے ہی وقت میں اپنے مقام پہ اٹل ہوتا ہے۔ سوال ہی نہیں ہوتا کہ وہ کچھ Give and Take (کمک مکا) کر سکے' Compromise (مفاہمت) کر سکے' مفاہمت پیدا کر سکے۔ میں اکثر یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک شخص دو اور دو چار کہتا ہے' دوسرا دو اور دو چھ کہتا ہے۔ اب چار کہنے والا حق پر ہے' چھ کہنے والا باطل پہ ہے۔ درمیان میں کوئی دوسرے بھی آ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ صاحب! باہمی ضد سے کیا حاصل ہے' آیئے کچھ Compromise (مفاہمت) کر لیں اور Compromise (مفاہمت) یہ ہو کہ تم بھی مان لو' میں بھی مان لیتا ہوں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ اب وہ جو چھ کہنے والا تھا' اس کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ وہ پہلے بھی باطل پہ تھا' اب بھی باطل پہ ہے۔ یہ جو پہلے چار کہنے والا تھا وہ حق پہ تھا' اس کا تو رہا ہی کچھ نہیں۔ یہ تو اگر سوا چار بھی کہہ لے گا تو اپنے مقام سے گر گیا۔ حق کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے مقام پر اٹل ہو۔ اس میں Compromise (مفاہمت) نہیں ہو سکتا' اس میں کوئی دوسری چیز شامل نہیں ہو سکتی' اور پھر قرآن ہی کے الفاظ میں

---

❶ یہ لوگ ان حربوں پر اس لیے اتر آئے ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ تو اس قسم کے طعن و تشنیع سے تنگ آ کر مفاہمت پر آمادہ ہو جائے یعنی کچھ تو اپنے مقام سے ہٹے' کچھ یہ نرم پڑیں اور اس طرح تم دونوں میں مفاہمت کی شکل پیدا ہو جائے لیکن تم ان کی بات بالکل نہ ماننا (اس لیے کہ جو شخص حق پر ہو اس کے لیے اپنے مقام سے ہٹنا اس کی شکست ہے' حق اپنے مقام سے ہٹا تو باطل ہو گیا۔ اس کے برعکس باطل کوئی بھی مقام اختیار کر لے اس کا کچھ نہیں بگڑتا' وہ پہلے ہی باطل تھا پھر بھی باطل رہے گا' صحیح جواب ایک اور صرف ایک ہوتا ہے غلط سینکڑوں ہو سکتے ہیں۔ (17:74:11:113)

اس کے حصے بخرے بھی نہیں ہوسکتے کہ اس کے کچھ حصے کو آپ مانیں اور کچھ حصے سے انکار کر دیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ یا تو پورے کا پورا حق لینا ہوگا یا اسے چھوڑنا ہوگا کیونکہ یہ بھی غلط ہے کہ اس کا کوئی حصہ لے لیا جائے اور دوسرے حصے سے انکار کر دیا جائے' جبکہ یہ چیز تو مفاہمت کی یا Compromise کی ہے لہٰذا جو حق پر ہے' اگر وہ یہاں ذرا بھی ایک قدم اس سے اِدھر اُدھر ہوا وہ باطل پہ آ گیا۔

حق حق ہے اور باطل باطل ہے۔ حق پر مفاہمت نہیں ہوسکتی

عام طور پر لوگ کہیں گے کہ صاحب! یہ بڑا ضدی ہے' اپنی بات پہ اڑا ہوا ہے۔ دیکھیے مفاہمت کرانے والے ثالث بیچ میں آ جاتے ہیں۔ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ اسے دیکھیے صاحب! وہ اپنا مقام چھوڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے میں مانے لیتا ہوں' میں پیچھے آ جاتا ہوں' میں کہہ دیتا ہوں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں اور یہ ضدی ہیں' صاحب! اپنے مقام سے ہل ہی نہیں رہا۔ عزیزانِ من! ضدی اور حق پرست میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ضدی وہ ہوتا ہے جو اپنی بات پہ ناحق اڑا رہے حالانکہ اس نے جو بات خود اختیار کی ہے' یہ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس کو چھوڑ کے دوسری بات اختیار کر لے۔ اب اگر وہ اپنی بات پہ ناحق اڑا ہوا ہے تو وہ ضدی کہلائے گا لیکن جو حق کو لے کر آگے بڑھا ہے وہ حق کو چھوڑ کیسے دے' اسے ضدی نہیں کہا جاتا' اسے اصول پرست کہا جاتا ہے۔ جو لوگ حق کے ماننے والے ہیں وہ اصول پرست ہوتے ہیں' ان کی یہ ضد نہیں ہوتی۔ حق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹیں۔ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہر مقام پہ مفاہمتیں کرتا ہے' حق مفاہمت نہیں کرتا۔

اب قرآن کی اگلی آیات آئی ہیں۔ ان میں ان مفاہمت کرنے والوں کا ذکر ہے اور عجیب چیز ہے جو قرآن نے بتائی ہے۔ یہ Characterless (بے کردار) لوگ ہوتے ہیں' ان کا کوئی کیریکٹر نہیں ہوتا یعنی پہلے ہی جو بات وہ پیش کر رہے ہیں وہ ایسی نہیں جس کے متعلق ان کو یقین ہو کہ یہ حق ہے۔ صرف حق میں Compromise (مفاہمت) نہیں ہوسکتا' یہ اٹل ہے۔ باطل یہ کچھ نہیں ہوتا' یہ سودے بازی ہوتی ہے کہ یہ کہہ دو جیسے دوکاندار نفع لینے والا کرتا ہے۔ بیچنا تو اس نے سو روپے میں ہوتا ہے' ڈیڑھ سو روپے قیمت بتاتا ہے اور پھر کہتا ہے: ''جی تسی دسو: کی دیو گے؟''[1] جس دوکاندار کے ہاں یہ اصول ہوگا کہ میں وہی کہونگا جو مجھے لینا ہے اس پہ اگر آپ یہ کہیں گے کہ صاحب! کچھ کم کرو تو وہ کہتا ہے کہ صاحب! آگے چلے

---

[1] آپ بتائیں: کیا دو گے؟

جایئے' یہاں یہ اصول نہیں ہے۔ یہ جو اس طرح سو روپے کے ڈیڑھ سو روپے کرنے والا ہے قرآن نے اب آگے یہ کیٹگری (Category) بتائی ہے۔ عجیب وغریب چیزیں اس میں آتی ہیں۔ اس نے بتایا ہی یہ ہے کہ جو Compromise (مفاہمت) کرنے والا ہے' یاد رکھیے! وہ حق پر نہیں ہے' ضدی ہے اور یہ بات بتاتا نہیں ہے کہ میں حق پر نہیں ہوں لہٰذا اس قسم کی پست ذہنیت کے انسان کے لیے قرآن نے پانچ چھ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ کسی خاص شخصیت کے متعلق بات نہیں کر رہا' وہ ان لوگوں کی ذہنیت بتا رہا ہے جو حق کی دعوت دینے والوں کے ساتھ یہ Attitude (رویہ) اختیار کرتے ہیں' یہ روش اختیار کرتے ہیں۔ وہ حق کے ساتھ Compromise (مفاہمت) کرنے کی دعوت لے کر آتے ہیں۔ یہ پست ذہنیت' Characterless (بے کردار) لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا بلکہ کردار تو اس کا ہے جو حق پر ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ پانچ چھ الفاظ قرآن لے کر آیا ہے۔

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ کوئی خاص شخص تھا جس کے متعلق یہ کچھ کہا گیا ہے اور نہ ہی یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن معاذ اللہ کسی کو گالی دیتا ہے۔ قرآن تو بتوں کو گالی دینے سے بھی منع کرتا ہے چہ جائیکہ اپنے کسی مخالف کو' اپنے کسی حریف کو' وہ گالیاں دینا شروع کرے (معاذ اللہ)۔ وہ ذہنیت بتاتا ہے کہ اس ذہنیت کے لوگ بھی آئیں گے اور یہ متعدد مقامات پہ کہا گیا ہے کہ اے رسول! یہ ٹھیک ہے' ہم جانتے ہیں کہ جو لوگ دلائل و براہین سے بات کریں گے' ان سے بھی تو تنگ نہیں پڑے گا' اور نہ ہی جو میدانِ جنگ میں کھلے بندوں شمشیر لے کر آئیں گے' ان سے تنگ پڑے گا' ہاں البتہ یہ جو اس قسم کی ذہنیت یا Character (کردار) والے لوگ آئیں گے' ہم جانتے ہیں کہ تو ان سے تنگ پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہا کہ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ [1] (73:10) یعنی یہ نہیں کہا کہ شمشیر لے کر ان کے مقابلے میں آ جاؤ' بلکہ کہا کہ یہ ''جو باتیں کرتے ہیں اس کو ہمت سے' حوصلے سے' برداشت کرو۔'' تو گویا وہ اس ذہنیت کے لوگ ہیں کہ اس کا جواب رسول یا حق پرست اس ذہنیت سے دے نہیں سکتا' وہ اس مقام پہ اتر ہی نہیں سکتا' یہ بڑا پست مقام ہوتا ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ پھر مقابلہ کس طرح کرے؟ سو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ برداشت کی کیفیت یہ ہے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ تُو تو اپنی جان گھلا دے گا' ہمت سے کام لو' دلبرداشتہ نہ ہو۔ تو گویا ان لوگوں کا یہ وہ ٹائپ (قسم) آتا ہے جن کی مخالفت میں مخالفت کم ہوتی ہے' پست ذہنیت اور کمینہ پن زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے لیے کہا کہ وَلَا تُطِعْ (68:10) یہ جو Compromise یا

---

[1] اور اپنے مخالفین کی کسی بات سے اثر پذیر مت ہو' بلکہ ان کی طرف سے صرف نظر کر کے' اپنے پروگرام پر ثبات اور استقامت سے جمے رہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

مفاہمت کرنے والے آتے ہیں پہلے ان کی یہ بات مت مانو۔ اب دیکھیے کہ ان کی کیا کیا خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ کہا کہ

كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ❶ (68:10)

قسمیں کھانے والا شخص خود اعتمادی کے جوہر سے محروم ہوتا ہے

عزیزانِ من! اس آیت میں لفظ ہے مھین: پست ذہنیت کا' ذلیل کردار کا انسان۔ اور بتایا یہ ہے کہ جو حلاف ہوتا ہے' وہ بات بات پہ قسم کھائے گا۔ یہ جھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ سچے میں خود اعتمادی ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات کہتا ہے تو اس اعتماد کے ساتھ کہتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ سچ ہے' مجھے ضرورت نہیں ہے کہ میں قسمیں کھا کے اپنے جھوٹ کو سچ کر کے بتاؤں۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ بار بار قسمیں کھا کے' اپنی غلط بات کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرنے والا' حلاف ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے لیے ان چیزوں کے اندر سبق یہ ہے کہ ایسی سیرت ایک مومن کی نہیں ہونی چاہیے' نہ ہوسکتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کے متعلق کہا ہے کہ وہ ایسا تھا۔ یہ ان لوگوں کی ذہنیت بتائی ہے۔ قرآن تو قیامت تک آنے والوں کے لیے' ہم سب کے لیے' ایک ضابطہ ہدایت ہے۔ جن چیزوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ مذموم ہیں' یہ معیوب ہیں' اس قسم کی سیرت اور کردار پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی یہ خیال کرو کہ یہ بات کہیں تم میں نہ پیدا ہو جائے۔ حلاف جھوٹا ہوتا ہے۔ قرآن نے پہلے یہ بات کہی ہے کہ جھوٹا ہوتا ہے جو حلاف ہوتا ہے۔ جو بار بار قسمیں کھاتا ہے' وہ جھوٹا ہوتا ہے' اس لیے وَلَا تُطِعْ ❷ (68:10) اب اس کے بعد یہ کہا کہ وہ مھین ہوتا ہے۔

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ جس میں خود اعتمادی ہوتی ہے وہ وزن دار بات کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ میری بات سچی ہے جو ماننا ہے تو مانیے' نہیں تو نہ مانیے بلکہ اسے تو رنج پیدا ہوتا ہے اگر اسے کہا جائے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ مھین وہ ہوتا ہے جو حلاف ہوتا ہے۔ قرآن نے حلاف ہونا بڑا معیوب بتایا ہے۔ اب آگے چلیے۔

کچوکے مارنے والا شخص

عزیزانِ من! پہلے میں آپ کو الفاظ بتاتا ہوں کہ قرآن کس انداز میں لیے چلا آ رہا ہے۔ کہا کہ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ

---

❶ (یہ جو مفاہمت کی پیشکش لے کر آیا ہے اس کی حالت یہ ہے کہ) یہ بڑا دنی الطبع' پست ذہنیت کا مالک اور سخت جھوٹا ہے۔ اسی لیے اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے قسموں پر قسمیں کھائے چلا جا رہا ہے۔

❷ اس کی بات بالکل نہ ماننا

بِنَمِيْمٍ o مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ o عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِيْمٍ (68:11-13)۔اف! ان الفاظ کے معنی آپ کے سامنے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن کس قسم کا ایک کیریکٹر پیش کر گیا ہے۔اس آیت میں ایک لفظ ہے ھماز: ''پنجابی اچ کیندے نیں چوباں لان والا۔'' [1] اسے کچو کے مارنے والا کہتے ہیں۔ یہ کچو کے مارنے والا عجیب چیز ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں کمینی حرکتوں سے جماعت میں تفریق پیدا کرنے والا اور یہ یاد رکھیے کہ اس میں ہر وہ چیز ہے جو مھین کی ہے۔اس کے اندر کمینگی ہے' کچو کے مارنے والا' جماعت میں تفریق پیدا کرنے والا ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں وہ جسے ہر جگہ نقص ہی نقص نظر آئے' کوئی اچھی بات نظر ہی نہ آئے' مکھی کی طرح جب بیٹھے گندگی اور غلاظت پہ بیٹھے،کوئی چیز اسے خوبصورت اور حسین نہ نظر آئے' یہ ہر ایک کے عیب کی تلاش کرتا رہتا ہے' یہی ڈھونڈتا رہے کہ اس کے اندر برائی کہاں ہے' کتنی ہے' نقص ہی نقص دکھائی دے' اچھائی کہیں دکھائی ہی نہ دے۔ یہ عجیب قسم کی ایک ذہنیت ہے اور ذہنیت کے بدلنے سے تو سب کچھ بدلتا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ تم تو ایک طرف خدا بھی اس قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جو خود اپنی ذہنیت کو نہ بدل لے۔ سارا دارومدار ذہنیت کے بدلنے پہ ہوتا ہے۔ایک یہ ذہنیت بتائی کہ جسے ہر جگہ خرابی ہی خرابی نظر آئے' نقص ہی نقص نظر آئے' برائی ہی برائی نظر آئے۔اف! کس قدر جہنم کی زندگی ہے ایسے شخص کی۔

نبی اکرم ﷺ کی ایک پرمغز دعا

قرآن اس قسم کا تغیرِ نفس ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنے سے کرتا ہے کہ وہ خوبی کو خوبی دیکھتا ہے' خرابی کو خرابی دیکھتا ہے۔وہ نبی اکرم ﷺ کی چمکتی ہوئی ایک حدیث ہے' جو یوں نظر آتی ہے کہ یہ واقعی نبی اکرم کی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ''یا اللہ! مجھے وہ نگاہ دے جو ہر شے کی حقیقت کو دیکھ لے: برائی کو برائی دیکھے' بھلائی کو بھلائی دیکھے۔'' اور جب پھر قرآن کی بصیرت جسے نور اللہ' خدا کی روشنی' کہا گیا ہے' یہ تبدیلی وہ پیدا کرتا ہے کہ جس میں پھر انسان کو جہاں جہاں اچھائی ہوتی ہے وہ ابھر کر اپنی نگاہ میں نظر آتی ہے' یعنی وہ اس قسم کا چشمہ لگا لیتا ہے۔قرآن ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔وہ شعر یاد آ گیا جس میں کہا گیا ہے کہ:

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

---

[1] پنجابی زبان میں اسے کچو کے لگانے والا کہتے ہیں۔

قرآن نگاہوں میں یہ تبدیلی پیدا کرتا ہے اور عزیزانِ من! تبدیلی نگاہ یہ ہونی چاہیے کہ جہاں کسی میں کوئی چیز اچھی ہے' اُسے پہلے وہ نظر آئے' پھر یہ کچوکے نہیں مارے گا' یہ تفریق نہیں پیدا کرے گا' پھر یہ جہنم کی آگ میں نہیں جلے گا۔

کچوکوں کی خطرناک بیماری سے بچنے کا طریق

عزیزانِ من! کچوکے مارنے والی ذہنیت تو کسی میں اچھائی بھی دیکھتی ہے تو جل بھن اٹھتی ہے۔ اس کا ایک لفظ ہے: **ھماز**۔ آپ عربی زبان کی جامعیت دیکھیے کہ ایک لفظ میں کتنے معنی سمو کے رکھ دیتی ہے۔ یہ **وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ o الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ** ❶ (104:1-2)۔ اور وہاں وہ لفظ آیا ہے۔ **ھماز** یعنی **ھَمَّازٍ مَّشَّاءٍ** (68:11)۔ مشاء کے معنی ہوتا ہے: لگائی بجھائی کرنے والا' ہر وقت چلتا پھرتا رہنے والا کہ کبھی اس کے پاس' کبھی اُس کے پاس۔ اِدھر چلا گیا۔ کہا کہ سنا تم نے کچھ ایسے؟ یعنی اُس کا کام ہی یہ ہے کہ اِس کے پاس چلا جا رہا ہے' اُس کے پاس چلا جا رہا ہے' پھر رہا ہے' چل رہا ہے گویا لگائی بجھائی کے علاوہ اسے کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔ ہمارے دَور میں اِسے پروپیگنڈا کہتے ہیں اور یہ پروپیگنڈے کی The most effective یا مؤثر ترین یا بدترین شکل ہوتی ہے۔ صبح اٹھے اور اِدھر کہدیا: ''میاں! سنا کچھ تم نے؟'' اجی میں نے تو نہیں سنا۔ کہا کہ ''ویسے تو ہمیں کوئی بات نہیں لیکن چونکہ بات آئی تو میں نے کہا کہ میں آپ کو بتادوں' تم ان صاحب کو دیکھو' محلے میں کتنے نمازی پرہیزگار نظر آتے ہیں' دیکھا ان کے کرتوت کیا ہیں؟ لیکن ہمیں کیا صاحب! اپنی اپنی گور ❷ میں سب لوگوں نے جانا ہے۔ ہمیں کیا واسطہ! ویسے ذہن میں ایک بات آئی تھی تو میں نے کہا آپ کو بتادوں' دیکھنا! یہ کسی اور سے نہیں کرنا' ہمیں کیا واسطہ! اور یہ کیا اور آگے چلے گئے۔ پھر اس کے پاس چلے گئے۔ شام تک سارے شہر میں ریڈیو اور ٹی وی وہ پروپیگنڈہ نہیں کر سکتے جو یہ ایک اکیلا کر دے گا اور پھر پتہ ہی کہیں نہیں چلے گا کہ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی۔ جس سے پوچھو وہ یہ بات دہرائے گا اور اگر اس سے پوچھو' تو وہ کہدے گا کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ بدترین کریکٹر ہے۔

---

❶ (اے رسول! تم اس شخص سے برملا کہہ دو کہ) وہ شخص تباہ و برباد ہو کر رہے گا جس کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہو کہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ ایسے شخص کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ اگر قوم میں کوئی مصلح پیدا ہو جو سرمایہ داری کے نظام کے خلاف کچھ کہے تو یہ اس میں ہزار عیب نکالے گا' نکتہ چینی کرے گا' طعن و تشنیع تک اتر آئے گا' کوشش کرے گا کہ اس کے ساتھیوں میں پھوٹ پیدا کر دے۔

❷ قبر (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لگائی بجھائی کے بجائے بے نقاب ہو کر بات کریں

کسی کے خلاف کچھ کہنا ہے تو اس سے کہو' کھل کے کہو' دھڑلے سے کہو' سامنے آ کے کہو' بے نقاب کہو۔ عزیزانِ من! پھر عرض کر دوں کہ حلاف' مہین' ہماز' نمیم' زنیم اور مَنَّاعٍ وہ چیزیں ہیں جن سے مجتنب رہنے کے لیے قرآن نے انہیں بار بار دہرایا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ کسی خاص شخص کی یہ عادتیں بتا رہا ہے۔ کہا صرف یہ ہے کہ یہ کیریکٹر (کردار) نہیں ہونا چاہیے۔ یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں لگائی بجھائی کرنے والے کہتے ہیں' اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر۔ یہ مشآءٍ کیا لفظ ہے! پھر قرآنِ کریم نے اس لفظ کے ساتھ ایک لفظ اور لگایا ہے۔ وہ ہے: بِنَمِيْمٍ (68:11) بھڑکانے والا' برانگیختہ کرنے والا' مشتعل کرنے والا۔ ''بڑے بے حیا ہو تم' وہ اس طرح سے تمہارے خلاف کہتا ہے اور تم آرام سے بیٹھے ہوئے ہو' یہ بے حمیتی کہلاتی ہے' بے غیرتی کہلاتی ہے۔'' اس ذہنیت میں تحمل نہیں ہے' برداشت نہیں ہے۔ یہ کچھ کرنے والا بھڑکا رہا ہے' ہرانگیخت کر رہا ہے۔ یہ اپنی باتوں میں جھوٹ ملا کر' ہر جگہ فساد پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ہے بِنَمِيْمٍ (68:11)۔ اس کے بعد قرآن اس ذہنیت کی مزید وضاحت یوں کرتا ہے کہ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (68:12) کوئی بات بھلائی کی ہو' اس میں روڑے اٹکانے والا ہے' ایسی بات کرنے والا ہے کہ اس میں تخریب نکل آئے' مثلاً ''نی بہن! مبارک ہو' اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ میں نے کہا ہے کہ کوٹھے کے اوپر سے ہی جا کر مبارک دے آؤں' رشتہ لڑکے کی منگنی کے لیے آیا ہے بڑی خوشی کی بات ہے۔ اللہ ہر ایک کے ہاں یہ کچھ کرے' خوشی ہے بہن! اچھا! میں جاتی ہوں۔ میں تو دعا کرتی ہوں جیسے اللہ نے اس بچے کا رشتہ کیا ہے' اسی طرح اس کی مرگی بھی ہٹا دے تو اچھا ہے۔'' وہ نیچے لڑکے والے بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ اس طرح مبارک دینے آئی ہے۔ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ [1] (68:12)۔ کیا بات ہے! ایسی ذہنیت والے بڑے سجن بن کے آوندے نیں' [2] مثلاً بہت ہمدردی کے ساتھ اللہ کے ہاں دعا کرتی ہوں بہن! کہ جیسے تو نے یہ کیا ہے' اس کی مرگی بھی ہٹا دے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ کیریکٹر آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ اب آپ ذہن میں لاتے چلے جائیے' میں سمجھتا ہوں پردۂ سیمیں کی طرح آپ کے ہاں معاشرے کے اندر وہ لوگ آپ کے سامنے آتے جائیں گے اور اب تو خدا کے فضل سے ان کی بہتات ہے' کوئی زیادہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

---

[1] خود بھی کوئی بھلے کام نہیں کرتا اور لوگوں کو بھی بھلائی کے کاموں سے روکتا رہتا ہے۔

[2] اس ذہنیت کے مالک بڑے ہمدرد دوست بن کر آتے ہیں۔

تخریب کاری کے مختلف خطرناک پہلو

اب مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ کے بعد قرآن کہتا ہے کہ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ [1] (68:12) ۔ یہ تخریبی مقاصد میں سب سے آگے بڑھنے والا ہے• یہ عجیب چیز ہے کہ قرآن یہاں دو متضاد الفاظ لایا ہے: مُعْتَدٍ اور اَثِيْمٍ۔ اثمہ کہتے ہیں ''وہ اونٹنی جو تھک کر ڈار [2] سے پیچھے رہ جائے اور ''مُعْتَدٍ'' وہ ہوتا ہے جو آگے بڑھنے والا ہو' ہر برائی اور تخریب کے کام میں سب سے آگے آگے اور اچھائی کے کام میں سب سے پیچھے پیچھے۔ قرآن کیا کیریکٹر بتا رہا ہے' عزیزانِ من! آگے کہا: عُتُلٍّ [3] (68:13) ۔ یہ وہ ہے جو بیدردی سے جیسے کسی بکرے کو یا بکرے کی لاش کو گھسیٹ کے لے جانے والا اور سب کچھ ہڑپ کر جانے والا ہو' یہ دوسروں کا سب کچھ ہڑپ کرنے والا ہے' جو گھسیٹ کر لے جائے۔ اس کے بعد کہا کہ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ [4] (68:13)۔ زنیم یونہی کسی کے ساتھ چپکا ہوا۔ اس کے دو معنی ہوتے ہیں کہ خود تو وہ شاخِ خزاں دیدہ ہو' اپنا ایک پتہ بھی نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ چپک کر ان کو چوستا چلا جائے۔ ایک ہی لفظ کے اندر یہ دو چیزیں ہیں: ہر قسم کی شادابی و خوشحالی سے محروم' دوسروں کا خون پینے والا۔ اب آپ دیکھ رہے ہیں قرآن کیا کچھ کہہ گیا ہے' کیا کیریکٹر پیش کر گیا ہے' کس قسم کی تصویریں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ جھگڑنے کے لیے کیریکٹر تو یہ ہے اور بڑا کس طرح سے بن گیا ہے؟ اس کے جواب میں کہا کہ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ (68:14) سرمایہ دار ہے' روپیہ بہت ہے اور اس کے پاس ووٹس (Votes) بہت ہیں۔ اس زمانے میں قبائلی زندگی کے اندر اولاد ہوتی تھی' قبیلے کے افراد ہوتے تھے۔ ان پہ بڑائی کا دارومدار ہوتا تھا:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات [5]

---

[1] انسانیت کے صحیح قانونِ حیات سے سرکشی برتنے میں سب سے آگے اور منفعت بخش تعمیری کاموں میں سب سے پیچھے رہتا ہے۔

[2] قطار

[3] بیدرد' شقی القلب' سخت گیر' جھگڑالو' ہر وقت نیت یہ کہ لوگوں کا سب کچھ سمیٹ کر ہڑپ کر جائے۔

[4] یہ زندگی کی سرسبزی اور شادابی سے یکسر محروم ہے اس لیے برا ہی ذلیل اور کمینہ ہے' پیراسائیٹ طفیلی' پیرتسمہ پا: (Parasite) ہے۔

[5] اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔60۔

یہ جو آج مغرب کی جمہوریت ہے وہی زندگی ہے' اکثریت ہاتھ اٹھانے والوں کی ہے۔ وہاں اُس دَور میں قبائلی زندگی تھی وہاں اکثریت کے لیے اپنی اولاد' اپنے رشتہ دار' گنے جاتے تھے۔ ان کی بنا پہ قبیلے کا بوجھ اور وزن ہوتا تھا۔ آج اسی طرح سے ذرا سی اس کی شکل بدلی ہوئی ہے۔ دیکھیے قرآن دو چیزیں کیسے اکٹھی کر گیا۔ کہا: ذَا مَالٍ وَّ بَنِیْنَ (68:14) اس کے لیے سرمایہ داری بڑی ضروری چیز ہے۔ پیسے ہوں تو پھر جتنے جی چاہے آپ ووٹ اکٹھے کر لیجیے۔ یہ سب آپ کے بنین ہوتے ہیں' جتنے بیٹے جی چاہے خرید لیجیے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کا کیریکٹر یہ ہے اور اس میں ساری خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس پیسے ہیں اور جتھہ مضبوط ہے۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ پارٹی بڑی تگڑی ہے۔

عزیزانِ من! حق کو تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ اس کی تائید میں کتنے ہاتھ اٹھتے ہیں۔ حق کی دعوت دینے والا تو اکیلا ہی ہوتا ہے: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) میں سب سے پہلا اکیلا سرِ تسلیم خم کرنے والا ہوں' میرا کوئی سیکنڈ (تائید) کرنے والا بھی نہیں لیکن میں ایک اکیلا ہی حق کے اوپر ہوں۔ حق کے ثبوت کے لیے اکثریت کے سارے معیار ہی غلط ہیں' اکثریت کس کی ہے؟ حق کس کی طرف ہے؟ آج کی جمہوریت میں تو اکثریت کی طرف ہے۔ اور حق تو' بہرحال' امتِ مسلمہ ہو یا کوئی دوسری قوم ہو' وہ تو خدا کی کتاب ہی ہے۔ سوال ہی یہ ہے' Deciding Factor (فیصلہ کن حقیقت) ہی یہ ہے کہ خدا کی کتاب کس کی تائید کرتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر ایک ووٹ بھی نہ ہو تو بھی وہ حق پہ ہے' اور سو فیصد ووٹ لے جانیوالا بھی اگر اس کے خلاف ہے تو وہ حق پر نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے کہا کہ وہ اس قسم کی سیرت و کردار کے باوجود لوگوں کا لیڈر اس لیے بنا ہوا ہے کہ وہ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیْنَ (68:14) ہے یعنی اس کے پاس روپیہ ہے' ووٹ زیادہ ہیں لیکن اس سے اس کے پاس' حق نہیں ہو جاتا۔ قرآن کیا کیا چیزیں کہتا جاتا ہے۔ پھر آگے کہا کہ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (68:15) جب اس کے سامنے قرآن کے حقائق پیش کیے جاتے ہیں' بتایا جاتا ہے کہ جس قوم نے بھی یہ روش اختیار کی تھی اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی تھا تو وہ کہتا ہے کہ یہ اگلے لوگوں کی بنائی ہوئی کہانیاں ہیں' افسانے ہیں' ہمارے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے' یہ محض افسانے ہیں۔

یہ زندگی کی مستقل اقدار ہیں

کہا کہ اے رسول! یہ ہیں وہ لوگ جو اب مقابلے میں' آ رہے ہیں: سَنَسِمُهٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ (68:16)۔ یہ محاورہ ہے جیسے ناک کاٹ دینا۔ جسے کہتے ہیں کہ اس کی ناک چوراہے میں کٹے گی۔ کہا کہ یہ جو اتنا بڑا عزت والا بنا پھرتا ہے اس کی ''ناک'' بیچ چوراہے کے کٹے گی' اس کا انجام یہ ہوگا۔ تو واقعی یہ جتنی مخالفتیں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ کے خلاف

جس جس انداز سے ابھری تھیں' ان سب کا انجام ایک ہی ہوا تھا۔ انہیں بری طرح شکستیں ہوئی تھیں۔ قرآن آگے ایک مثال کے ذریعے بات سمجھاتا ہے کہ یہ کردار کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس قسم کا معاشرہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن نے کیا مثال دی ہے اور غلط اور صحیح معاشرے کے اندر کیا بنیادی بات کہہ گیا ہے: اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ❶ (68:17)۔ قرآن کا سمجھانے کا انداز یہ ہے کہ آیئے' تمہیں ایک محسوس مثال سے بات سمجھائیں۔ یہ کوئی واقعہ نہیں ہوتا بلکہ قرآن ایک مثال دیتا ہے۔ قرآن نے دو مقامات پر یہ مثال پیش کی ہے ایک سورۃ کہف میں باغ والوں کی مثال ہے ❷ :(18:32-40)

باغ والوں کی ایک سبق آموز مثال

عزیزانِ من! اس کے علاوہ یہاں (68:17) میں بھی قرآن نے باغ والوں کی ہی مثال دی ہے۔ کہا کہ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (68:17) انہوں نے کہا کہ بھئی! پھل پک گیا ہوا ہے' کل صبح ہی صبح چلیں گے اور وہ پھل کاٹ لیں گے۔ باغ بڑا شاداب تھا' ثمر بار تھا' پھلوں سے پودے جھکے ہوئے تھے' پھل Ripe ہو گئے تھے' پک گئے ہوئے تھے اور یہ اپنا پھل توڑ کر صبح منڈی لے کر جائیں گے۔ اب یہ دیکھیے کہ فرق کیا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ (68:18) انہوں نے یہ کہا کہ اس میں کسی محتاج' غریب اور مسکین کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ باغ بہت بڑا ہے' پھل پکے ہوئے ہیں' یہ اسے توڑنے جا رہے ہیں۔ اب ایک ہی بات کہدی کہ اس میں محتاج و مسکین کا حصہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک ذہنیت ہے۔ سرمایہ داری کی ذہنیت ہی یہ ہوتی ہے۔ قرآن نے قارون ❸ کے متعلق کہا ہے۔ کہ اسے کہا گیا تھا کہ تو نے اتنا مال' اتنی دولت جمع کر لی ہے تو دیکھو اس میں غریبوں' مسکینوں اور محتاجوں کا حصہ ہے۔ اس پر اس نے کہا تھا کہ یہ میری کاریگری ہے

---

❶ ہم اسے ایسا پلٹا دیں گے جیسا (مشہور مثال میں) باغ والوں کو پلٹا دیا تھا۔ (اسی قسم کی مثال (18:32-44) میں بھی آئی ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس مثال کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الکہف و سورۃ مریم' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص ص: 83-79

❸ قارون فسادِ سرمایہ داری کا مظہر تھا۔ اس کی مزید تفصیل و تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص۔ 124 (فٹ نوٹ نمبر 1)

جس کی وجہ سے میں نے یہ جمع کرلیا ہے' اس میں غریبوں اور مسکینوں کا کیا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اس کے جمع کرنے میں کیا کیا ہے۔ یعنی اس نے یہ دلیل دی تھی کہ مجھے یہ میری کاریگری سے ملا ہے۔ اس لیے اس میں کسی کا حق نہیں ہوسکتا۔ اب بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ ہر سرمایہ دار خود سے محنت نہیں کرتا۔ یہ جتنا کچھ تمہارے پاس آ رہا ہے' یہ انہی غریبوں کی محنت کا نتیجہ ہے لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ میرا سرمایہ' میری تکنیک' میری ہنرمندی' میری کاریگری' چالاکی' فریب کاری' یہ سب کچھ میں نے کیا ہے اور یہ مال ومتاع میرے پاس آ گیا' اس میں ان کا کیا ہے؟ وہ یہ کہتا ہے۔

عزیزانِ من! اب یہ دیکھیے کہ مثال کہاں آ رہی ہے: بھرے ہوئے باغات ہیں' ذہنیت یہ ہے کہ ان میں کسی محتاج اور مسکین کا کوئی حصہ نہیں ہے تو اس کا انجام کیا ہوا؟ قرآن نے بتایا کہ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ (68:19) یہ فیصلہ کر کے' کہ صبح جا کے پھل کاٹ لیں گے' وہ سو گئے اور سوتے ہی سوتے باہر سے ٹڈی دَل آیا اور وہ ایسا آیا کہ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (68:20) اس نے اس سارے باغ کو ایسے کر دیا جیسے کسی کھیت سے فصل کو کاٹ لیا جائے اور باقی بنجر رہ جائے۔ یوں ٹڈی دَل کا ایک طوفان آیا' جس نے سب ختم کر دیا۔ آپ کو یاد ہے کہ وہ جو سورہ الواقعہ (56) کی آیات 63 سے 74 تک جاتی ہیں' ان میں قرآن نے کھیتی اُگانے والوں کو یہ کہا تھا کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ اس میں تمہارا حصہ کتنا ہے' ہمارا کتنا ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ یہ زمین کس کی ہے: ہماری ہے یا تمہاری؟ تم تو صرف ہل ہی چلاتے ہو' پانی کی ضرورت ہے کیا تم پانی بنا سکتے ہو؟ نہیں' یہ ہم بھیجتے ہیں۔ حرارت کی ضرورت ہے۔ کیا سورج تمہارا ہے؟ نہیں' یہ ہمارا ہے' تم تو صرف اس کی نگہداشت کرتے ہو' تھوڑی سی محنت کرتے ہو۔ کھیتی پک گئی' کھلیان تیار ہو گئے۔ اب اس کے بعد کہا کہ یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار تھا۔ یہ خدا کہہ رہا ہے' کہ دیانتدار کاروبار کی طرح آؤ' حصہ کرلیں' اس کو بانٹو' تمہاری تو صرف محنت ہے باقی ساری انوسٹمنٹ ہماری ہے۔ ہمارا حصہ ہمیں دے دو' اپنا حصہ آپ لے لو کیونکہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) انسان تو صرف محنت کا حقدار ہوتا ہے۔ جس کمائی میں محنت شامل نہیں ہے' صرف انوسٹمنٹ ہے' وہ حرام ہے' ربٰو ہے۔ کہا: تمہاری محنت ہے' تم اپنا حصہ لے لو' ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔ کہا کہ جی! آپ تو کہیں نظر ہی نہیں آتے' کہیں ملاقات ہی نہیں ہوتی' تو آپ کو حصہ کس طرح سے دیں۔ کہا کہ بھوکوں کو دیدو' یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ بات ان باغ والوں کی ہو رہی تھی۔ کہا کہ یہ کہہ کے وہ صبح گئے۔ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ (68:21) صبح اٹھ کر ایک دوسرے کو پکارا کہ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ (68:22) اٹھو' چلو جلدی صبح ہی صبح جا کے فارغ ہو جائیں' پھل کاٹ لائیں۔ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ o اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ

مِّسْكِيْنٌ (68:23-24) چنانچہ وہ اس مقصد کے لیے اپنے گھروں سے روانہ ہوئے۔ وہ چلتے جا رہے تھے اور چپکے ہی چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ دیکھنا! ایسا انتظام کرنا' ایسی احتیاط کرنا کہ کوئی بھوکے محتاج یہاں نہ جھپٹ کے آ جائیں' ان کی عادت ہے انہیں پتہ لگتا ہے کہ کھیتی کاٹنے گئے ہیں تو یہ ہجوم کر کے آ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جا رہے تھے کہ کوئی بھوکا اِدھر نہ آنے پائے' اس کا انتظام کر لینا وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ (68:25) چنانچہ وہ اس طرح باغ کے قریب گئے اور انہوں نے ایسا انتظام کر لیا کہ وہ کسی غریب کو قریب نہ آنے دیں۔ وہ چار آدمی باہر کھڑے کیے ہوئے ہوں تو غریب بیچارہ کہاں جا سکتا ہے؟ وہ تو مانگنے والا ہوتا ہے۔ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ❶ (68:26)۔ قرآن کا کیا انداز ہے جو اسٹوری بیان کرتا ہے! کہتا ہے کہ وہ اپنے ہی باغ پر پہنچے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ او میاں! کوئی راستہ تو نہیں بھول گئے۔ یہ ہم آپ کہاں آ گئے؟ کہا کہ راستہ تو تم آج نہیں بھولے' دیر کے بھولے ہوئے ہو۔ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں: یہ ہم کہاں آ گئے؟ پھر اس کے بعد آنکھیں ملیں' ذرا دیکھا تو کہا کہ نہیں' باغ تو وہ ہمارا ہی ہے مگر ہوا کیا؟ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (68:27) اس پر وہ سر پیٹ کر بیٹھ گئے اور چلا اٹھے کہ ہمارا تو بیڑہ غرق ہو گیا' کچھ رہا ہی نہیں' چٹی پڑ گئی' ساری محنت گئی' سب کچھ تباہ ہو گیا' ہم برباد ہو گئے' دہائی مچا دی۔ ایک جھٹکا آیا تھا خدا کا۔ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ (68:28) ان میں سے ایک شخص ذرا اعتدال رکھتا تھا' اُس کا ذہن مدہوشی کے عالم میں نہیں تھا' اس کے ہوش کچھ برقرار تھے۔ اس نے کہا کہ میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ تم اپنی تمام جدوجہد کو خدا کے قانون کے تابع رکھو' تم نے میری بات نہ مانی۔ یہ اُسی کا نتیجہ ہے۔

عزیزانِ من! اب یہاں میں پھر عرض کروں کہ یہاں لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ آیا ہے۔ اس کے عام ترجمے آپ دیکھیں گے کہ ''وہ کہتا تھا کہ میں نہیں کہا کرتا تھا کہ تسبیح بھی پھیرا کرو' دیکھ لیا تسبیح نہیں سی پھیر دے۔'' ❷ کہا کہ کیا میں یہ نہیں کہا کرتا تھا؟

فَسَبِّحْ بِاسْمِ بِرَبِّكَ الْعَظِيْمِ (56:74) خدا کی ربوبیتِ عظمیٰ کے لیے ساتھ تگ و تاز کیا کرو' اس کے لیے محنت کیا کرو' کوشش کیا کرو۔ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (68:29) یوں اس پہ انہوں نے اعتراف کیا کہ ہاں ٹھیک ہے' ہم ہی زیادتی کر رہے تھے' جو اس میں غریبوں اور مسکینوں کا حصہ نہیں شامل کرتے تھے۔ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

---

❶ جب وہ وہاں پہنچے تو (باغ اور کھیتوں کو دیکھ کر) کہنے لگے کہ آج ہم کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے؟ یہ تو ہمارے باغات اور کھیت معلوم نہیں ہوتے۔

❷ تم نے دیکھ لیا کہ تم تسبیح نہیں پھیرتے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

یَّتَلَاوَمُوْنَ (68:30) پھر وہ آپس میں جھگڑنے لگے جیسے ایسے وقت میں ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تیرا بیڑہ غرق' تو نے یہ کرایا۔ دوسرا اس کو کہتا ہے کہ میں نے وہ کہاں کہا تھا؟ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگ گئے۔ وہ اس نتیجے پہ نہ پہنچے کہ اِس میں یہ سارے ہی مجرم ہیں قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ (68:31) اور اس کے بعد پھر افسوس کرتے ہوئے آ گئے کہ واقعی ہم نے ہی قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تھی' اس لیے یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔ کہا کہ عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (68:32) اب ہم آئندہ احتیاط برتیں گے اور اس میں غریبوں کا حصہ رکھیں گے۔ اس کے مطابق عمل کریں گے تو ہمیں یقین ہے کہ خدا ہماری محنتوں کا ہمیں بھرپور نتیجہ دے گا۔

عزیزانِ من! بات یہ ہوئی تھی کہ ہم تمہیں باغ والوں کی بات سمجھاتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کا' جو اس طرح ہر چیز پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں' اپنے مال اور بنین کے زور پر حق کی مخالفت کرتے ہیں' ان کا نقشہ الٹ کے رکھ دیں گے' بالکل ایسا جیسے اُن باغ والوں کا نقشہ الٹا تھا۔ دیکھا' مثال کیا دی ہے؟ قرآن محسوس مثال دیتا ہے' وہ صرف ذہنی نہیں ہوتی' صرف اعتقادی نہیں ہوتی' یونہی نہیں ہوتا کہ ان کا بیڑا غرق ہو جائے گا' وہ سچ مچ دکھاتا ہے کہ بیڑا غرق ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح سے جن کی یہ ذہنیت ہوتی ہے ان کا نقشہ ہی الٹ جائے گا کیونکہ وہ صرف مال اور جتھے کی مضبوطی کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں' اور پھر حق کی مخالفت کرتے رہتے ہیں لیکن آخر کار اُن کی یہ صورت ہو جائے گی کہ نہ مال رہے گا' نہ بنین رہیں گے' نہ جتھہ رہے گا' نہ دولت رہے گی اور پھر قوت بھی نہیں رہے گی۔ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا کہ کَذٰلِکَ الْعَذَابُ (68:33) پھر اے رسول! ان سے کہدو کہ اسے کہتے ہیں خدا کا عذاب۔ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والوں پر اس دنیا میں تباہی آتی ہے اور دیکھا کس مثال سے قرآن کیا سمجھاتا ہے اور پھر عذاب کے معنی کیا بیان کرتا ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں' ہر بار کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے آخرت کی زندگی' اس کا عذاب وثواب برحق ہے لیکن یہ عذاب وہیں نہیں آتا' یہ عذاب یہاں سے شروع ہوتا ہے اور یہی تو وہ چیز ہے جس سے انسان کو درسِ عبرت مل سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہا کہ کَذٰلِکَ الْعَذَابُ (68:33) ان سے کہو کہ یہ ہے وہ عذاب جس سے میں تمہیں وارن (آگاہ) کر رہا ہوں کہ یہ کچھ ہو جائے گا۔

اپنی طرف سے قرآن میں کچھ اضافہ کرنا شرک ہے

عزیزانِ من! اب وہ بات جو میں بار بار کہتا ہوں کہ یہ یہاں کا عذاب ہے اور وہاں کا بھی عذاب ہے۔ میں اپنی

طرف سے کچھ نہیں کہتا' قرآن ہاتھ میں لے کر' اپنی طرف سے کچھ کہنا تو شرک ہے' اس سے اللہ محفوظ رکھے۔ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ط وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (68:33) یہ ہے عذاب جو اس دنیا میں آتا ہے' آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ بڑا ہوگا۔ وہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ دنیا کا عذاب ہے' جب وہ ذلت' محکومی' محتاجی' مسکینی اور غیروں کا محتاج ہونا عذاب بتاتا ہے تو پھر اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں محو رہنا کہ نہیں' ہم خدا کے محبوب کی محبوب امت ہیں' اس لیے ہم تو خدا کے پسندیدہ ہیں' ہم پہ عذاب نہیں آ سکتا' عذاب دوسروں پہ آتا ہے' مبنی برصداقت نہیں ہے۔ کہا کہ تمہاری یہ کیفیتیں ہیں۔ تم کہنے لگے ہو کہ دنیا چار دن کی بات ہے' اس میں کونسا ہمیشہ رہنا ہے اصل میں تو عذاب وثواب آخرت کا ہے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھیے گا کہ جنت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اتھے سانوں جتیاں پیندیاں تے پین دیو۔ ❶

قوانینِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ: ہر طرف محرومی ہی محرومی ہے

قرآن کہتا ہے کہ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ (68:33) اے رسول! تم اِن مخالفت کرنے والوں کو بتا دو کہ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والوں پر اس طرح' اس دنیا میں' تباہی آیا کرتی ہے۔ یوں عذاب آتا ہے: اناج سے بھرے ہوئے کھلیان ہیں مگر قوم بھوکی مر رہی ہے' پھلوں سے لدے ہوئے درخت خالی ہو جاتے ہیں' غریب ایک ایک چیز کو ترستا ہے' وہاں تو غریب کا بچہ ایک چھوٹے سے بیر کے لیے بھی ترس رہا ہے۔ یہ ہے كَذٰلِكَ الْعَذَابُ (68:33)۔ وہ جو انہوں نے کہا تھا کہ ہم محروم ہو گئے' وہ صرف ٹڈی دَل ہی محروم نہیں کرتی' انسانوں کے جو ٹڈی دَل ہیں وہ تو بیڑہ غرق کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی کے نصیب میں کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو غلط نظام ہے وہ خدا کا عذاب ہے۔ مثال یہ بتائی ہے کہ سب کچھ ہوتے سوتے بھی یہ کیفیت ہو کہ اس قوم کے اندر محتاجی اور مسکینی گھر کر گئی ہو' ہر سُو محرومیت ہو۔ قرآن نے اسے محروم کہا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (68:33) اے کاش! غلط نظام والے اس بات کو سمجھ سکتے جو ہم نے کہا ہے کہ بھرے ہوئے کھلیان خالی ہو جاتے ہیں اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت ٹنڈ منڈ رہ جاتے ہیں۔ اگر نظام غلط ہو تو لینے والے لے جاتے ہیں اور جو سال بھر' دن رات محنت کر کے' گاڑھے پسینے کی کمائی سے' یہ پیدا کرتے ہیں' وہ محروم رہتے ہیں: كَذٰلِكَ الْعَذَابُ (68:33) یہ ہے وہ عذاب۔ کیا بات ہے!

---

❶ یہاں ہمیں جوتے پڑتے ہیں تو پڑنے دو۔

قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا نتیجہ: نعمتوں کی بارش

اس کے برعکس قرآنِ کریم نے ایک دوسرے گروہ کی بات کی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (68:34) جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والے ہیں' جو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے والے ہیں' ان کے لیے نعمتوں اور خوشحالیوں کے باغات ہیں۔ وہ تو ایک باغ ہے' یہاں جنّت کہا ہے یعنی ان کے لیے بہت سے باغات ہوتے ہیں۔ پہلے باغ کی مثال دی تھی' اب قرآن یہاں بھی باغ ہی کا لفظ لایا ہے۔ کہا ہے کہ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (68:34) ان سے کہو کہ انہیں ایسی جنتی زندگی نصیب ہوگی جس میں ہر قسم کی آسائشیں ہوں گی۔ ذرا سوچو کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ (68:35) کیا ایسا ہو سکے گا کہ ہم مسلمین کو مجرموں جیسا بنا دیں؟ اللہ اکبر! قرآن نے امتیازی خط کھینچ دیا: مسلمان اور مجرم برابر نہیں ہو سکتے۔ جو مجرم ہے' وہ مسلمان نہیں ہوتا' اور جو قوم المجرمین ہے وہ قوم المسلمین نہیں ہو سکتی۔ یہ بات قرآن کہہ رہا ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم مسلموں کو اور مجرموں کو برابر' یکساں' ایک جیسا' کر دیں؟ یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے تو ایسی واضح مثال دی ہے کہ جس میں کسی ذہنی عقیدے کے لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس نے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنین پر غالب آ جائیں۔ اب جسے ہم ''مومنین یا مسلمان'' کہتے ہیں' ان کے پیچھے تو اب ساری دنیا کی کفار قومیں لگی ہوئی ہیں' وہ اقوام ان پر غالب ہیں اور یہ مغلوب ہیں۔

مسلمین کی پہچان

قرآن کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا' خدا کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم مسلمین کو مجرموں جیسا بنا دیں۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ کیا چیز ہوگی؟ یہی بات ہوگی کہ جن پر یہ غالب ہیں وہ مومنین ہیں ہی نہیں۔ پہچان یہ ہوگی کہ جماعتِ مومنین پر کفار غالب نہیں آ سکیں گے' پہچان یہ ہوگی کہ مسلمین مجرمین جیسے نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن کیا بات کہہ رہا ہے؟ یہ کہ مَا لَکُمْ (68:36) او تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ (68:36) جو تم اس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟ تم کس طرح اپنے فیصلے الٹے سلٹے کرتے رہتے ہو؟ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ معاشرے کے اندر جرائم بھی عام ہو رہے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ کچھ وقتی سی بات ہے' یہ کچھ بات نہیں ہے' مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے' اسلامی ہونے میں کوئی کسی قسم کا فرق نہیں ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ مَالَکُمْ (68:36) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ جو تم اس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟ او کیا فیصلے تم خود اپنے ذہن سے کرتے ہو؟ فیصلہ تو یہ ہے جو ہم نے کیا ہے۔ اَمْ لَکُمْ کِتٰبٌ فِیْہِ تَدْرُسُوْنَ (68:37) کیا قرآن کے سوا

کوئی اور کتاب تمہارے پاس ہے جس میں یہ فیصلے لکھے ہوئے ہیں؟

عزیزانِ من! یہ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ ایک کتاب نہیں' ان کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے جن میں یہی فیصلے لکھے ہوئے ہیں کہ یہ دنیا کفار کی ہے' مجرموں کی ہے۔ مومن' اس دنیا کے اندر' ایسے رہے گا کہ جس طرح قیدی جیل خانے میں رہتا ہے۔ ایسی کتابیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہ غربت اور مسکینی فخر ہے' ذلت اور محتاجی خدا کے بندوں کی نشانیاں ہیں۔ یہ کتابیں ہیں جن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اِنَّ لَکُمْ فِیْہِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ (68:38) کتابیں تمہارے پاس ہیں کہ جو وہ کچھ بتاتی ہیں جو تم چاہتے ہو۔ تم تو اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں کا درس دیتے ہو۔

اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں کا درس دیتے ہو

عزیزانِ من! جس کے سامنے قرآن ہو' وہ اور کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ مگر تمہارے ہاں وہ کتابیں ہیں تم تَدْرُسُوْنَ (68:37) انہی کی تدریس کرتے ہو' انہی کو اپنے دارالعلوموں میں پڑھاتے ہو' انہی کے مطابق وعظیں کہتے ہو' انہی کے مطابق قوانین بناتے ہیں۔ یہ کتابیں تمہارے پاس ہیں اس لیے تم انہیں سینے سے لگائے ہوئے ہو کہ اِنَّ لَکُمْ فِیْہِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ (68:38) جو تم چاہتے ہو' وہ کتاب وہی کچھ تمہیں دیدیتی ہے کہ ٹھیک ہے جی! آپ کی مرضی کے مطابق شرعی قانون ہو جائے گا۔ وہ کتابیں یہ دیتی ہیں۔ اَمْ لَکُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَۃٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (68:39) یا تم نے ہم سے کوئی اس قسم کا وعدہ لے رکھا ہے کہ قیامت تک کے لیے تم ہی ہماری محبوب امت رہو گے۔ ہے کوئی اس قسم کا پیمان جو تم نے ہم سے لے رکھا ہے کہ تم جو جی میں آئے کرتے رہو' کیا کوئی اس قسم کا وعدہ لے رکھا ہے؟ وہ وعدہ کہ اِنَّ لَکُمْ لَمَا تَحْکُمُوْنَ (68:39) جو کچھ تمہارا جی چاہے تم فیصلے کرو' جس طرح سے جی چاہے قانون بناؤ' فتوے دو' وہ سب کے سب خداوندی قرار پا جائیں گے۔ کیا یہ ہے کہیں؟ کہ فیصلے تو تم اپنی طرف سے کرو اور کہو یہ کہ نہیں' ہم نے خدا سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ خدائی فیصلے قرار پا جائیں گے' وہ اسلامی قوانین قرار پا جائیں گے۔ یہ لَمَا تَحْکُمُوْنَ (68:39) بڑی غور طلب چیزیں ہوتی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن کا لفظ جو اس نے کہا ہے وہ یہ ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (6:57) حکم صرف خدا کا ہے۔

اپنے فیصلے خدا کی طرف منسوب کرنا: یہی کفر ہے

قرآن نے کہا ہے کہ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کی کتاب کے

مطابق حکم نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ کہا کہ پھر تم نے ہم سے کوئی ایسا عہد لے رکھا ہے' تمہارا' ہمارے ساتھ آپس میں کوئی Agreement (معاہدہ) ہے کہ تم جو فیصلے کرو' وہ ہمارے فیصلے سمجھے جائیں۔ یہاں وہی تَحْکُمُوْنَ (68:39) حکم کا لفظ ہے' یہ فیصلوں کا ہے' حکومت کا ہے' قانون سازی کا ہے۔ سَلْھُمْ اَیُّھُمْ بِذٰلِکَ زَعِیْمٌ (68:40) اے رسول! ان سے پوچھو' ان سے کہو کہ وہ اپنا بڑا لاؤ جو چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر یہ کہے کہ میں نے خدا سے اس قسم کا عہد لے رکھا ہے اور اس کے پورا کرنے کا میں ذمہ دار ہوں۔ اَمْ لَھُمْ شُرَکَآءُ (68:41) یا اس معاملہ میں ان کے کوئی اور شریک ہیں۔ یہ خود نہیں ہیں' ان کے ساتھ کچھ شریک ہیں' جو آ کے کہیں کہ ہاں صاحب! شریعت کا یہی فیصلہ ہے۔ قرآن نے یہاں شرکا کہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو فَلْیَاْتُوْا بِشُرَکَآئِھِمْ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ (68:41) ان سے کہو کہ پھر اپنے ان شرکا کو لاؤ' اگر تم سچے ہو' تا کہ وہ بتائیں کہ کون سی وہ کتاب ہے جس کے اندر ہم نے یہ لکھ کر دیا ہوا ہے' کونسا وہ عہد و پیمان ہے جو انہوں نے ہم سے کیا ہوا ہے۔ اگر تمہیں خود معلوم نہیں ہے تو اپنے ساتھی' شرکا' کو لے آؤ' Advisors (مشیر) بھی اپنے ساتھ لے آؤ' ان سے کہو کہ وہ آ کر بتا دیں۔

سیکولرازم اور اسلامی حکومت میں فرق

عزیزانِ من! اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظام کا' ایک ہی چیز' ایک ہی لفظ' فیصلہ کر دیتا ہے: جہاں بھی یحکم یا تحکم' فیصلہ کرنا' حکم دینا' حکومت کرنا' کتاب اللہ کے مطابق ہے وہ اسلامی ہے' خداوندی ہے اور جہاں تحکمون ہے کہ تم جو خود فیصلے کرو' وہ غیر اسلامی ہے' اسے سیکولرازم کہتے ہیں۔ تم سے مراد مخاطب افراد ہی نہیں ہوتے' انسان ہوتے ہیں۔ جہاں یحکم یا تحکم ہے۔ جو خدا کے فیصلے ہیں وہ اسلامی نظام ہے اور انسانوں کے فیصلے' آج کے انسانوں کے فیصلے' یا ہزار سال پہلے کے انسانوں کے فیصلے' وہ سارے تحکمون میں آئیں گے جو تم فیصلے کرتے ہو۔ اسلامی نظام یا اسلامی شریعت یا اسلامی حکومت کہتے ہی اس کو ہیں کہ جس میں فیصلے انسان نہیں کرتے' جس میں فیصلے خدا کی کتاب کرتی ہے۔ تحکمون شرک ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (6:57) حکم صرف خدا کا ہے اور لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (18:26) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں' فیصلہ کرنے کے حق میں' کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں کس قدر واضح الفاظ میں کہا کہ کیا کچھ کتابیں ایسی ہیں: فِیْہِ تَدْرُسُوْنَ o اِنَّ لَکُمْ فِیْہِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ (68:37-38) جن کو تم پڑھتے پڑھاتے رہے ہو۔ جن میں یہ لکھا ہے کہ تم جو روش چاہو اختیار کر لو' نتائج تمہارے حسب پسند نکل آئیں گے؟ اس کے برعکس ان میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ سارے قوانینِ فقہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں' وہ آج کے انسانوں کے ہوں یا

ہزار سال پہلے کے انسانوں کے ہوں' وہ کہتا ہے کہ کیا یہ عہد لے رکھا ہے کہ اِنَّ لَکُمْ لَمَا تَحْکُمُوْنَ (68:39) یہ ہے کہ تم فیصلے کرواور وہ خدائی فیصلے قرار پا جائیں۔ ہاں یہ کہا کہ سَلْھُمْ اَیُّھُمْ بِذٰلِکَ زَعِیْمٌ [1] (68:40) اے رسول! ان سے پوچھو کہ لاؤ اس بڑے کو جو یہ زعم کرتا ہے کہ ہمارے فیصلے خدا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اَمْ لَھُمْ شُرَکَآءُ فَلْیَاْتُوْا بِشُرَکَآئِھِمْ (68:41) یا اس معاملے میں اُن کے کوئی اور شریک ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان سے کہو کہ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ (68:41) اگر وہ سچے ہیں تو اپنے شرکاء کو بھی سامنے لاؤ اور اس طرح اپنے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت دو اور پھر آگے ہے کہ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ [2] (68:42)

عزیزانِ من! آگے بات چلے گی کہ جب غلط نظام کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آئیں گے اس وقت یہ بات ان کے بس میں نہیں رہے گی کہ کسی طرح سے اس تباہی سے بچ جائیں۔ جیسا کہ یہ بات بار بار آ چکی ہے کہ غلط روش کے تباہ کن نتائج فوری نہیں سامنے آیا کرتے۔ قرآن اس کو مہلت کا وقفہ کہا کرتا ہے۔ اس مہلت کے وقفے کے بعد جب وہ غلط روش کے تباہ کن نتائج کا پھل پک جاتا ہے تو اس وقت عذاب اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ کھیتیاں اجڑ جاتی ہیں' باغ ویران ہو جاتے ہیں' مال تباہ ہو جاتے ہیں' جتھے ختم ہو جاتے ہیں' اور خدا کا قانون غالب آتا ہے۔ اُس وقت مسلم اور مجرم ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔

عزیزانِ من! سورۃ القلم کی آیت 41 تک ہم آ گئے' 42 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀

---

[1] ان سے پوچھو کہ تم میں وہ کون ہے جو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہے کہ میں نے خدا سے اس قسم کا عہد لے رکھا ہے اور اس کے پورا کرنے کا میں ذمہ دار ہوں۔

[2] (یہ سب ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات اٹل ہے۔ لہٰذا) اب وہ وقت بہت قریب آ رہا ہے جب ان کی اس غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آ جائیں گے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑے گا۔ چاروں طرف سے شدت کی سختیاں امنڈ کر آ جائیں گی۔ اس وقت ان میں سے بعض انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں لیکن اس کا وقت گزر چکا ہوگا۔ اُس وقت یہ بات اُن کے بس کی نہیں رہے گی کہ کسی طرح اِس تباہی سے بچ جائیں۔ (ظہورِ نتائج کے وقت مہلت کا عرصہ ختم ہو جاتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

SOCIAL VALUE SYSTEM

By

Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

الذين يوفون بعهد الله ولاينقضون الميثاق. والذين يصلون ماامر الله به ان يوصل ويخشون ربهم ويخافون سوء الحساب... بالحسنة السيئة اولئك....

"Those who fulfill the pact of Allah, and break not the covenant. And those who join that which Allah has bidden to be joined and are frightened of the consequences of disobeying the laws of Allah. And fear the evil reckoning. And those who are steadfast seeking the pleasure of their Nourisher, follow His laws in all spheres of life and keep available for the needy of that which Allah has given them. They spend openly or secretly in the way of Allah as appropriate and repel evil with good…" 13/20-22

That is why everybody is at peace with them including their enemies who are also sure that whatever the provocation, Momins will not overstep the laws by which they have promised to live.

انا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله ولاتكن للخائنين خصيما.

"O Nabi, We have revealed to you this set of values so that you would judge between people on the basis of what light Allah has shown you…" 4/105

But the enemies also know that they cannot take the Momins for granted. The Momins know how to treat with the enemy and they amply show their intentions before hand.

ياايها الذين امنوا لاتتخذوا عدوي وعدوكم اولياء تلقون اليهم بالمودة وقد كفروا بما جاءكم من الحق... وانا اعلم بما اخفيتم وماعلنتم ومن يفعله منكم... ويبسطوا اليكم ايديهم والسنتهم بالسوء وودوا لو تكفرون.

"O you who believe, take NOT My enemy and your enemy for friends. Would you offer them love while they can not be trusted to live by just laws. They drove you and the Messenger from your homes just because of your wanting to be free to live by your way of life. If you have come forth to strive in My way and to seek My pleasure, would you love them in secret. If they overcome you, they will be your enemies, and will stretch forth their hands and their tongues towards you with evil and they desire that you may disbelieve..." 60/1-2

Do not join them but instead remember how Abraham (pbuh) and his followers dealt with their enemies.

قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه اذ قالوا لقومهم انا برأؤا منكم ومما تعبدون من دون الله... وبدا بيننا وبينكم... تؤمنوا بالله وحده الا قول ابراهيم لابيه لاستغفرن لك...

"Indeed there is for you a good example in Abraham (pbuh) and those with him when they said to their people, we are not responsible for you because of your following the laws of other than Allah. We disbelieve in you and there has arisen enmity and hatred between us and you for as long as you insist on not living according to a set of laws given by the Lord…" 60/4

A Momin will have intimate relationship with another Momin. He will have a complete understanding with those who live by a declared set of laws, even though those values might differ from his own. But he will have no sharing of confidence with those who do not believe in any value system and, as such, their actions are always unpredictable. Even so a Momin should give due respect to such people provided they do not initiate an act of hostility.

والذين لايشهدون الزور واذا مروا باللغو مروا كراما.

"Momins are those who witness no falsehood and when they pass by what is in vain, they do so gracefully." 25/72

It is a waste of time and energy to develop any meaningful relationship with people who subscribe to no value system.

واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه وقالوا لنا اعمالنا ولكم اعمالكم سلام عليكم لانبتغي الجاهلين.

"And when Momins hear idle talk, they turn aside from it and say: For us are our deeds and for you your deeds. Peace be to you. We do not desire any meaningful relationship with ignorant people…"28/55.

But this does not mean that a Momin should look down upon other people just because of differences in ways of life.

ياايها الذين امنوا لايسخر قوم من قوم عسى ان يكونوا خيرا منهم ولانساء من نساء عسى ان يكن خيرا منهن...ولاتنابزوا بالالقاب بئس الاسم...بعد الايمان....

"O you who believe, let not set of people look down upon or treat with disdain another set of people. Perchance they may be better than you. This includes both men and women. And, also do not find faults among your own people or others when such faults are not there, nor should you give nick names to others. Such habits do not suit you after you have adopted Islam as a way of life…"49/11

Once you develop a disliking for a set of people you tend to ascribe to them all sorts of evil without first ascertaining whether such rumors about them are based on fact or not. This does not suit a Momin.

يايها الذين امنوا اجتنبوا كثيرا من الظن ان بعض الظن اثم ولاتجسسوا ولايغتب بعضكم بعضا ايحب احدكم ان ياكل لحم اخيه ميتا فكرهتموه واتقوا الله ان الله تواب رحيم.

"O you who believe, avoid thinking unwell about one another based on unascertained information. Many times, this will lead to very harmful consequences. Do not unnecessarily go deep into each other's personal lives or back bite against each other. Does one of you like to eat the flesh of his dead brother. (This is what backbiting amount to). Surely, you would abhor it…" 49/12

When Momins inculcate some of the individual character traits as mentioned above and collectively adopt the value systems as detailed in other chapters, they become a power to reckon with amongst the comity of nations in the world. They should not let their status lead to believe that they have become some sort of super human. They must behave in a humble and graceful way so that they attract others to adopt their way of life.

وعباد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما.

"And the servants of the Beneficent, are they who walk on the earth in humility and when ignorant address them, they say, peace. ' 25/63

ولاتصعر خدك للناس ولاتمش في الارض مرحا ان الله لايحب كل مختال فخور. واقصد في مشيك واغضض من صوتك ان انكر الاصوات لصوت الحمير.

"And turn not your face away from people in contempt, nor go about in the land exultingly. Surely, Allah does not love any self conceited boasters. And, pursue the right course in thy going about and lower your voice. Surely, the most hateful of voices is braying of asses…" 31/18-19

As Momins, they should steadfastly continue to strive their utmost to pattern their lives on the value system given by God. For this, they will have to take decisions of their own too, remaining within the limits of Allah, and they might, on occasions, take wrong decisions, God's grand design caters for such minor lapses. These lapses do have their consequences but provided major limits of Allah are not crossed, they do not result in uncontainable disasters.

والذين يجتنبون كبائر الاثم والفواحش واذا ماغضبوا هم يغفرون.

"Momins are people who avoid such major disastrous actions as materially affect the growth of human personality and remain decent. And, if by a minor default, they do become angry on such occasions, they do not harm others. " 42/37

These are trying occasions. Emotions run high when consequences of minor lapses start harming a stable society. Here is when decent people remain firm in sticking to the higher value, confident that the consequences of minor lapses will pass away. They have committed themselves to a way of life and they will not be deviated from this way when minor disasters overtake them as a result of their failings.

والذين هم لاماناتهم وعهدهم راعون.

"Those who steadfastly stand by their commitments under all circumstances." 70/32

Mysticism has made it fashionable to degrade life in this world. The universe is unreal, it is argued. Humans are therefore, enjoined to shun material things. As argued in other chapter, the Quran debunks this theory in clear words. The universe is not unreal, a plaything of the God. It is meant for a positive purpose. Human beings must use the material things available in the world to improve the quality of life, not only their own but of the entire species in the universe. Life, however, does not pertain to this world alone. Bodily death is not the end of the life for those whose balance of positive actions in this world entitles them to graduate to a higher life. At death, the human body disintegrates. But personality lives on.

Hence the Quran lays great stress on development of not only the human body but also of personality. How does personality develop to graduate into a higher life? The body develops because of what we take in i.e. food, drink, entertainment, healthful activities and so on. Contrarily, the personality develops when we give out. Hence, the continuous stress by Quran that Momins must give of their time, money, love, life when necessary for others in need. In fact, often times a Momin gives to others such resources of which he may be in dire need himself. This creates a balance in society as well as leads to an integration and strength of human personality.

ونفس وماسواها. فالهمها فجورها وتقواها. قد افلح من زكاها. وقد خاب من دساها. كذبت ثمود بطغواها. اذ انبعث اشقاها.

"Human personality has been created so that man has a potential to integrate it or disintegrate it at his choice. Whoever strengthens and integrates his personality graduates to a higher life. And, whoever prefers to disintegrate his personality dies away forever on his physical death." 91/7-12

And how is the personality strengthened. Says the Quran.

فاما من اعطى واتقى. وصدق بالحسنى. فسنيسره لليسرى. واما من بخل واستغنى. وكذب بالحسنى. فسنيسره للعسرى. ومايغني عنه ماله اذا تردى.

"And whoever gives of the earning of his hard work for growth of others, to maintain balance in society, he proves by his positive actions that mankind is one. Such a man lives a useful and graceful life. And, whoever keeps his earning to himself for his own selfish needs showing thereby that he can live independently of others around him lives a wretched and ungraceful life. His accumulated wealth is of no use to him." 92/5-11

The personality of the givers is further strengthened when they assure those whom they give that this action of theirs is not meant as a favour to them.

الذي يؤتى ماله يتزكى. .. من نعمة تجزى. الا ابتغاء وجه ربه الاعلى.

"The Momin gives for nourishment of those who are temporarily in need. He does so not as a favour to the needy or that he expects a reward in return, but only because the laws of God convince him that this will result in restoring balance in humanity." 92/18-20

The givers graduate in a higher life on physical death thus achieving immortality. The deniers die and that is the end of the line for them for all times. A sad end indeed.

CHARACTERISTICS OF GOD TO BE ADOPTED BY MAN

According to the Quran, there is a definite and positive purpose in the creation of human beings. They have been created so that by exploiting nature, they produce useful things for humanity so that life goes on improving as time goes by and humans become more and more adept at discovering the bounties of nature and using those bounties for benefiting humanity.

وذكر فان الذكرى تنفع المؤمنين. وماخلقت الجن والانس الا ليعبدون. ماارید منهم من رزق ومااريد ان يطعمون.

"O Messenger, keep reminding the Momins of the laws of nature. Living according to the laws of nature will benefit mankind. In fact, the aim of creation of mankind is that civilized (developed) as well as underdeveloped people together strive to live by the divine value system and thus benefit mankind. The aim is not for mankind to nourish God. God does not need this from humans…"51/55-57

To enable them to be of maximum benefit to humanity, humans are advised to develop traits of God in their personalities, as for as humanly possible, as defined in the Quran.

ولله الاسماء الحسنى فادعوه بها وذروا الذين يلحدون في اسمائه سيجزون ما كانوا يعملون.

"God has personality characteristics. Try and imbibe those characteristics, (as far as humanly possible) in your personality. (A judicious use of these character traits will restore balance in humanity). When you develop these character traits and then follow the laws of Allah, you will be fully compensated for actions…" 7/180

The Momins are advised to strive in congruity and partnership with the forces of nature. When they do so, they will reflect divine characteristics.

صبغة الله ومن احسن من الله صبغة ونحن له عابدون.

"We take Allah's colour and who is better than Allah at coloring. And we do so by following His laws…" 2/138

It would, therefore, be useful to compile a list of characteristics of God as given in the Quran and use that as a guide for development of human personality. It must, however, be clearly understood that humans are just that and not divine. Allah possesses those characteristics in their highest form. Man will never become Allah but he is asked to be as close to Him as possible. And closest to God is that person who follows His law in all spheres of life under all circumstances. It may also be mentioned that not only individuals' [1]bur but nations are also advised to collectively imbibe these characteristics of Allah in their administrative machineries. This would facilitate individuals in their efforts to get close to Allah.

We are now ready to list (Asma-ul-Husna), divine characteristics as enumerated in the Quran. I would request the readers to exercise their judgment as to how far humans could reflect these characteristics in their individual and collective life. I have deliberately kept my own comments short but, I hope, adequately descriptive.

1) RABB

The provider of free and ample means of nourishment and growth at all stages from creation of humans until they achieve their full potential. 1/1

2) RAHEEM

One who continuously keeps providing means for growth for progressive evolution, at all stages. 1/2

3) RAHMAN

One who provides means of growth when changes in conditions require emergent evolution. 1/2

4) MALIK

One who has complete control and authority. One who exercises authority in such a manner that it ensures growth of universe in an orderly and lawful manner. 59/23.

---

[1] Bur: a person or thing that clings persistently.

5) QUDDUS

A completely developed personality free of any deficiency or shortcoming. 59/23

6) SALAM

One who keeps the universe protected from afflictions of all kinds and whose system ensures this protection for all times. 59/23.

7) MOMIN

One who can be completely trusted and with whom you can live at peace 59/23.

8) MOHAIMIN

One who protects the universe as a mother protects her children 59/23.

9) AZIZ

One whose laws are supreme in the universe. No power can counter or challenge His laws. 59/23.

10) JABBAR

One who ensures that any breakage in a system is prevented by the splints of his laws. 59/23

11) MUTAKABBIR

One who is the owner of all superiority and greatness. 59/24.

12) KHALIQ

One who creates something according to a thought out pattern. Created thing would be balanced in all respects, free of any defects. 59/24

13) BARI

One who, after creating something, isolates it from other superfluous matters. 59/24.

14) MUSAWWIR

One who after creating something in a perfect pattern and isolating it from other superfluous matters give it a distinct shape of its own. 59/24

15) GHAFFAR

One who, if you follow His laws, will give you protection so that no harmful consequences accrue as a result of following His laws. 20/82.

16) QAHHAR

One whose laws are supreme on everyone. Nobody can break His laws and then bring about consequences of his own choice. Only those consequences will follow which His laws predict. 12/39.

17) WAHAB

One who freely gives a lot without asking to be compensated for it 3/7

18) RAZZAQ

One who provides the means of nourishment of body as well as personality and ensures continuous supply of means of subsistence on time to everybody. 11/06

19) FATTAH

One who makes major decisions. One who simplifies complicated problems and manifests realities. 34/26

20) ALEEM

One whose every pronouncement is based on knowledge. The know all. 34/26

21) SAMI

The hear all. 3/34

22) BASEER

The see all. 67/19

23) LATEEF

One who is aware of the deepest secrets. One who employs knowing and polite language when explaining things. 67/14.

24) KHABEER.

One who keeps abreast of what is required to be known. 67/14

25) HAKEEM

One who uses the universe in a correct and logical way and thus keeps every thing under His control. 2/32.

26) HALEEM

One who is not excited in a hurry. One who keeps His cool and decides matters according to a law and not based on emotions. 2/225

27) AZEEM

One who is high and mighty and giver of high places to humanity. 2/256

28) A'LEE

High and mighty. 2/255

29) SHAKOOR

One who rewards other's efforts with fullest benefits for their hard work. 2/158

30) KABEER

One whose laws are sovereign. 13/9

31) MOTA'LL

One who is beyond reach. Whose laws nobody can change. 13/9

32) HAFEEZ

One who supervises to ensure preservation. 11/57

33) MUQEET

One who provides sustenance to all things in universe. Assists them. Their helper. 4/85

34) HASEEB

One who keeps an account. One who keeps watch. Keeps reckoning. 88/25

35) JALEEL

Honorable. Glorious. 55/27

36) KAREEM

Generous. Gives so that receiver does not feel any obligation. 96/3

37) MUJEEB

One who responds to a call and request 11/61

38) WASEH

One who has power. One who has abundance of resources. 2/115

39) RAQEEB

One who keeps alert constantly to look after, protect and supervise. 4/1

40) WADOOD

One who has great, lot of affection. 85/14

41) MAJEED

One who gives abundantly to the highest extent to enable others to live comfortably. 11/73

42) HAMEED

One who is to be praised because of His excellent characteristics. 11/73

43) SHAHEED

One who has His eyes over everything. Witness. Nothing escapes His vision. 22/17

44) WAKEEL

One whom you can completely trust. One whose laws will produce the promised results. 3/158

45) QAVI

Most powerful. The last word in possession of power. The strong. The mighty. 11/66.

46) MATEEN

One who is strong Himself and gives strength to others. Independently strong. 51/58.

47) HAQ

One who keeps inventing concrete things to keep pace with requirements of time. One whose existence cannot be denied. 10/30.

48 WALI

Friend. Confident. If man lives in conformity with divine values, God becomes that man's Wali and vice versa. 2/257.

49) HAYY

One who gives life to all but is not dependent on others for life. 2/255.

50) QAYYOOM

One who give balance and power to enable people to stand up to others but he does not need any support. 2/255.

51) SAMAD

One who is so high and mighty that people go to him for protection. Whose protection would be continuous. Himself independent of any support. 112/2

52) QADIR

One who has control over things. One who initiates a thing, determines the various steps it has to take for its development and helps it to achieve its potential provided it takes steps determined for its development. 2/284.

53) BARR

Benign. Conferrer of noble behavior. Truthful. 52/28.

54) RAUF

One who removes obstacles in the way of human endeavors to become fruitful. Compassionate. Creates positive results of good work. 2/143.

55) AFUWW

One who dispels some of the consequences of a bad act by somebody provided that somebody follows up his bad act with good acts. 4/43.

56) GHANI

One who is so independent that he does not need the services of anybody for His existence or development. 29/6

57) HADI

One who shows the way. 93/7

58) MUQSIT

One who fully compensates the full share due to somebody. 7/29.

59) WARIS

One who owns things and then things get transferred from Him to others. 3/179.

60) ADIL

One who treats equally two people requiring justice. Giver of equal share. 16/90.

61 BAQI

One who remains changeless when everything else changes with time. 55/26

62) MUBDI

one who initiates creation. 10/4

63) MOOED

One who after having initiated a creation, casts it around in various shapes and stages to bring it to completion. 10/4.

64) TAWAB.

One to whose laws you have to return whenever you have taken a wrong step at any time. 68/25.

65) QAREEB

One who is close to every body and quick to respond to a call. 11/61

I may well have missed out a few characteristics. Those can be added to the list. A careful study of these characteristics detailed above will reveal that it provides guidance for individuals to adopt character qualities which would make them better human beings and for societies to adopt courses of action which would enable their administrations to be more useful to their people. There is no voodoo or magic around these "Names of Allah". The figure ninety-nine names of God seem also to add to the voodoo effect. A constant oral repetition of these names will not produce any beneficial results. They

ought to be used for the much higher purpose for which they have been enumerated and that is to materially benefit humanity in their individual and collective lives.

FIVE PILLARS OF ISLAM

In the Muslim world in general, and in the sub-continent of India and Pakistan in particular, it has been traditionally believed for a long time, that there are five pillars of Islam.

a) Belief in one Allah.
b) Five daily prayers.
c) A month of fasting in Ramadhan
d) Zakat at 2 ½% of annual savings
e) Pilgrimage of Kaaba once in life for those who can afford it.

The Quran does not specifically mention the above as pillars, nor does it give an exact number. So, it must be kept in mind that the Ulema have highlighted the above, based on their own judgment rather than from a specific reference to the Quran. However, each one of them is highly important and we shall discuss them one by one in detail, noting what the Quran has to say about them in various chapters. We must not lose sight of our main aim when discussing this. We are pinpointing a divine value system to give guidance to Muslims in leading their individual and collective lives. I hope, by now, it is pretty clear that a belief in some dogmas or mere repetition of few words or movements does not take you very far in life. What is useful is constructive action, which helps in growth of human personality and promote universal peace and plenty.

(E N D)

****